أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ہمارا خدا

تصنیفِ منیف حضرت صاحبزادہ میرزا بشیر احمد صاحب ایم اے

جسے

مینیجر بک ڈپو تالیف و اشاعت قادیان دارالامان

نے

ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع کیا

اسلامیہ سٹیم پریس بھاٹی دروازہ لاہور میں باہتمام محمد منظور الزمان پرنٹر طبع

تقریرات و تصنیفات حضرت خلیفۃ المسیح ثانی

ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	منصب خلافت	ا ر	۱۵	حقیقت الامر	۲ر
۲	برکات خلافت	۴ر	۱۶	حقیقت النبوۃ	عہ
۳	انوار خلافت	۱۲ر	۱۷	آئینہ صداقت	عہ ۸ر
۴	حقیقت الرویار	۱۲ر	۱۸	کلام محمود (نظم)	۱۰ر
۵	ذکر الٰہی	۱۰ر	۱۹	گلزار معرفت "	۵ر
۶	عرفان الٰہی	۱۰ر	۲۰	ترکِ موالات	۸ر
۷	تقدیر الٰہی	عہ ر	۲۱	ہستی باری تعالیٰ	عہ ۴ر
۸	ملائکۃ اللہ	عہ ۶ر	۲۲	صادقوں کی روشنی	عہ ۸ر
۹	اسلام اور دیگر مذاہب	۴ر	۲۳	مدارج تقویٰ	۲ر
۱۰	اسلام میں اختلاف کا آغاز	۱۱ر	۲۴	خدا کے کام کون روک سکتا ہے	۰ر
۱۱	ہدایات زرین	۱۰ر	۲۵	چشمۂ توحید اردو	۰۲ر
۱۲	خطبات محمود	۱۴ر	۲۶	تحفہ شہزادہ ویلز باتصویر مجلد	عہ ۹ر
۱۳	تحفۃ الملوک درجہ اوّل	عہ ۸ر	۲۷	" " غیر مجلد	عہ ر
۰	" " درجہ دوم	۱۲ر	۲۸	نجات حصہ اوّل	
۱۴	القول الفصل			(یعنی تقاریر جلسہ سالانہ ۱۹۲۲ء)	۱۳

ملنے کا پتہ

منیجر بکڈپو تالیف و اشاعت قادیان دارالامان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

هو النــــــــــاصر

ہمارا خدا

تمہید ایک عرصہ سے میرے دل میں یہ خواہش تھی۔ کہ اپنے نوجوان عزیزوں کے لئے ہستی باریتعالیٰ کے متعلق ایک مضمون تحریر کروں۔ جس میں مختصر اور عام فہم طریق پر بعض وہ دلائل بیان کئے جاویں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا ایک خالق و مالک خدا ہے۔ جس کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ہمارے لئے ازبس ضروری ہے۔ اور پھر اس مضمون میں یہ بھی بتایا جاوے کہ ہمارے خدا کے یہ یہ صفات ہیں۔ اور اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں یہ یہ فوائد ہیں۔ اور نیز یہ کہ اس کے ساتھ کس طرح تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ وغیر ذالک۔ مگر آج تک کئی ایک وجوہات سے میں اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اب چند دن ہوئے کہ میرے ایک عزیز نے (خدا اسے حسنات دارین سے متمتع فرمائے) مجھ سے خدا تعالیٰ کے متعلق اپنے رنگ میں بعض سوالات کئے جس سے میری وہ قدیم خواہش میرے دل میں پھر تازہ ہوگئی۔ اور میں نے اس عزیز کے سوالات کو ایک تحریک غیبی سمجھ کر اس مضمون کے شروع کردینے کا ارادہ کرلیا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

میرے اس بیان سے یہ مطلب نہ سمجھا جاوے کہ مَیں نے اس مضمون کے واسطے کوئی خاص تیاری کی ہے۔ یا یہ کہ مَیں اس مسئلہ پر علمی لحاظ سے کوئی خاص روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ میرا منشاء صرف یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو میرے معلومات ہیں۔ ان میں سے بعض کو جو عام فہم ہوں مَیں اپنے نوجوان عزیزوں کے لئے مختصر اور سادہ طریق پر تحریر کردوں تاکہ اگر خدا چاہے تو میرا یہ مضمون کسی بھٹکتی ہوئی رُوح کی ہدایت اور کسی لڑکھڑاتے ہوئے قدم کی استواری اور کسی بے قرار اور پریشان دل کی تسکین کا موجب ہو۔ اور ہمارے عزیز اپنے اس مہربان اور سب محبت کرنے والوں سے بڑھ کر محبت کرنیوالے آقا و مالک کو پہچانیں جس کا پہچاننا اور جس تک پہنچنا ہماری زندگی کا مقصد ہے +

اے میرے مولیٰ تو میری سب کمزوریوں پر اطلاع رکھتا ہے۔ اور میری علمی اور عملی حالت بھی جو ہے تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ تو مجھے اپنے فضل سے یہ طاقت اور توفیق عطا کر کہ میں تیری رضا کے ماتحت اس مضمون کو تکمیل تک پہنچا سکوں۔ اور تو میرے الفاظ میں اثر پیدا کر۔ اور میرے قلم کو صرف حق و راستی کے طریق پر چلا۔ تاکہ تیرے بندے میرے اس بیان سے مستفید ہوں۔ اور تجھے پہچان کر اپنی زندگی کا مقصد حاصل کریں۔ اور اے میرے ہادی۔ گو میں اپنی نیت کو نیک پاتا ہوں لیکن تُو جانتا ہے کہ خود میرے متعلق بھی تجھے وہ علم حاصل ہے جو مجھے نہیں۔ پس اگر تیرے علم میں میری نیت کے اندر کوئی مخفی فساد ہے تو مجھ ناچیز پر رحم فرما۔ اور میری نیت کی اصلاح کر دے تاکہ میری کسی شامت اعمال کی وجہ سے میرا یہ بیان ان برکات سے محروم نہ ہو جاوے جو تیری طرف سے صداقت کی تائید میں نازل ہوا کرتی ہیں۔ اے میرے پروردگار تُو ایسا ہی کر۔ آمین +

اس زمانہ میں ایمان کی حالت

سب سے پہلے میں اس حد درجہ قابلِ افسوس اور نہایت دردناک حالت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جو اس زمانہ میں ایمان باللہ کے متعلق لوگوں کی پائی جاتی ہے۔ کہنے کو تو جتنے مذاہب بھی دُنیا میں ہیں وہ خدا کے قائل ہیں۔ اور ان مذاہب کی طرف منسوب ہونے والے لوگ بھی باستثنائے ایک نہایت قلیل تعداد کے جو برملا ہستی باریتعالیٰ کی منکر ہے خدا پر ایمان لانے کے مدعی

ہیں۔ لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جاوے۔ اور لوگوں کی ایمانی حالت کا ذرا گہرا مطالعہ کیا جاوے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ ایمان ایک محض رسمی ایمان ہے جس کو حقیقت سے ذرا بھر بھی تعلق نہیں۔ چونکہ لوگوں کا مذہب ان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے اور وہ اپنے باپ دادوں سے بھی یہی سُنتے چلے آئے ہیں۔ کہ ہمارا ایک خدا ہے۔ اور وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ قومی شیرازے کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ظاہری طور پر اپنے مذہب کے بنیادی اصول پر قایم رہیں۔ اور پھر ان کے دلوں میں گاہے گاہے یہ فطرتی آواز بھی اُٹھتی رہتی ہے۔ کہ ممکن ہے واقعی ہمارا کوئی خدا ہو۔ اس لئے وہ انکار کی جرأت نہیں کرتے اور ظاہراً اسی عقیدہ پر قائم ہیں کہ ان کا ایک خدا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے قائل نہیں۔ اور ان کے دل ایمان سے اسی طرح خالی ہیں جس طرح ایک غیر آباد اُجڑا ہوا مکان مکین سے خالی ہوتا ہے۔ میں یہ بات کسی خاص قوم کے افراد یا کسی خاص مذہب کے متبعین کے متعلق نہیں کہتا۔ بلکہ تمام دنیا کے متعلق کہتا ہوں۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ متبعین کنفیوشس زرتشتی۔ بدھ۔ ہندو۔ یہودی عیسائی سکھ مسلمان وغیرہم سب کے اندر یہ زہر کم و بیش سرایت کر چکا ہے۔ اور مادیت کی گرم اور شرر بار ہواؤں نے دُنیا کا کوئی چمنستانِ ایمان نہیں چھوڑا کہ اسے جلا کر خاک نہ کر دیا ہو۔ میرے اس دعویٰ پر اگر کوئی شخص دلیل مانگے۔ تو میں بفضلہ تعالیٰ اس کے سامنے ایسے دلائل پیش کر سکتا ہوں۔ جن سے کسی عقلمند غیر متعصب شخص کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس جگہ میں اس بات میں شک کرنے والوں سے صرف یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اپنے دل کی حالت کا مطالعہ کر کے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اور ان کے ملنے والے دوسرے لوگ خدا پر واقعی ایمان رکھتے ہیں؟ ایمان سے میری مُراد رسمی سُنا سُنایا ورثہ کا ایمان نہیں بلکہ زندہ حقیقی ایمان ہے۔ کیا خدا کی ہستی ان کے لئے ایسی ہی محسوس و مشہود ہے جیسے دُنیا کی مادی چیزیں ہیں۔ یعنی کیا خدا کے متعلق وہ ایسا ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ مثلاً ان کو یہ ایمان ہے کہ یہ سورج ہے اور یہ چاند ہے اور یہ پہاڑ ہے اور یہ دریا ہے۔ اور یہ ہمارا مکان ہے

اور یہ ہمارا باپ ہے۔ اور یہ ہمارا دوست ہے؟ اگر ایسا نہیں۔ تو پھر خوب سمجھ لو کہ یہ کوئی ایمان نہیں ہے بلکہ ایک شک کا مقام ہے۔ اور تم ایک مردہ اور متعفّن لاش کو زندوں کی طرح اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے بیٹھے ہو۔ اور اگر یہ کہو کہ یہ مرتبہ ایمان کا جو بیان کیا گیا ہے یہ انتہائی مرتبہ ایمان کا ہے جس تک پہنچنے والے بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں اور صرف خاص خاص لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ تو میں یہ کہوں گا کہ یہ بات تمہاری ناواقفیت کا ایک مزید ثبوت ہے کیونکہ ایمان کا انتہائی مرتبہ تو وہ ہے جس کی ہوا بھی ابھی تم تک نہیں پہنچی۔ اور شاید تم میں سے اکثر لوگ اس کا نقشہ بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے اور یہ مرتبہ ایمان کا جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی خدا کے متعلق ایسا ایمان ہونا جیسا کہ اس دنیا کی مادی چیزوں کے متعلق انسان کو حاصل ہے یہ ایمان کے درمیانی مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ کیا تم نے حدیث میں آنحضرت صلعم کا وہ قول نہیں پڑھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے عام مراتب میں سے ایک مرتبہ یہ ہے کہ انسان آگ میں ڈالا جا کر خاک ہو جانا پسند کرے گا۔ لیکن ایمان کو ہاتھ سے نہ چھوڑے گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان کے اس مرتبہ سے اپنے آپ کو فروتر پاتے ہو تو کم از کم میرا تم سے یہ سوال ہے کہ کیا تم دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہو کہ تمہارا ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر عملاً تمہاری زندگی پر اثر پیدا کر رہا ہے؟ یعنی کیا تم اپنے دل میں واقعی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی ناراضگی کا خوف محسوس کرتے ہو۔ اور کیا تمہارا ایمان تمہیں واقعی نیکی کی تحریک کرتا اور بدی سے روکتا رہتا ہے؟ اور کیا واقعی تمام امور میں تمہارا اصل بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور مادی اسباب پر نہیں ہوتا؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ کیا تم کبھی اپنے دل میں خدا کے ساتھ وابستگی محسوس کرتے ہو یا نہیں یا کبھی اللہ تعالیٰ کا خیال تمہیں گناہ سے روکتا اور نیکی کی تحریک کرتا ہے یا نہیں۔ یا کبھی مادی اسباب سے آگے گذر کر تمہاری نظر خدا تک پہنچتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہو جانا ایمان کی حالت کا نتیجہ نہیں کہلا سکتا۔ ایسی حالت اس شخص کی بھی ہو سکتی ہے جسے صرف اس قدر بصیرت حاصل ہے کہ وہ خدا کا انکار نہیں کرتا۔ اور گاہے گاہے اسکی

طبیعت میں یہ خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ شائد واقعی کوئی خدا ہو۔ جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اور جو اس تمام کارخانہ عالم کا چلانے والا ہے۔ اور جس کے سامنے کسی دن میں نے کھڑا ہونا ہے۔ ایسا شخص یقیناً کبھی کبھی خدا کے اِس خیالی بُت کے ساتھ ایک حد تک وابستگی محسوس کرے گا۔ اور اس کا یہ خیال کبھی کبھی اسے گناہ سے روک دے گا۔ اور کبھی کبھی نیکی کی بھی تحریک کر دے گا۔ اور گاہے اس کی نظر مادی اسباب سے گذر کر خدا تک بھی پُہنچے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ اصل بھروسہ کے قابل صرف خدا کی ذات ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالت ایمان کی حالت نہیں کہلا سکتی۔ بلکہ ایک شک کی حالت ہے جو اس کی طبیعت میں کبھی ایک طرف کا اور کبھی دوسری طرف کا اثر پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایمان کی حالت تبھی سمجھی جاوے گی۔ جب خدا کے متعلق ایک زندہ یقین کی حالت پیدا ہو جاوے۔ اور یہ یقین ایک مستقل جذبہ کے طور پر علی وجہ البصیرت دل میں قائم ہو۔ جو انسان کی زندگی کا ایک حصہ بنجاوے اور اس کی رُوح کی غذا ہو جاوے۔ اور ہر وقت اس کے واسطے ایک ایسی شمع ہدایت کا کام دے۔ جو اسے گناہ کے تاریک رستوں پر متنبہ کرتی رہے اور اس کے ذریعہ سے نیکی کے راستے اس کی آنکھوں کے سامنے روشن ہوتے رہیں۔ اور تمام مادی اسباب اس کی نظر میں ہیچ ہو جائیں یعنی ان پر اس کا تکیہ نہ رہے۔ بلکہ اس کا اصل بھروسہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ جو اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اور خدا کی آتشِ محبت اس کے دل میں سوزاں رہے۔ اور اس کی ناراضگی کا خوف اس کے دل پر غالب ہو۔ اب دیانتداری کے ساتھ بتاؤ کہ کیا تم واقعی ایسا ایمان اپنے دلوں میں پاتے ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو اپنے آپ کو مومن کہتے ہوئے شرماؤ اور اس ایمان کی تلاش میں لگ جاؤ جو آسمان سے اُترتا ہے اور بجلی کے ایک زبردست لمپ کی طرح دل کے دور دراز اور تاریک و تار کونوں کو منوّر کر دیتا۔ جس کے بعد خدا کا وجود ایک خیالی بُت نہیں رہتا جسے تمہارے دماغوں نے گھڑا ہو بلکہ وہ ایک زندہ۔ حیّ و قیّوم ذی اقتدار۔ مگر مشفق و مہربان بادشاہ نظر آتا ہے۔ جس کی حکومت دیکھنے والوں کے لئے ان کو نتوں

سے کہیں بڑھ چڑھ کر محسوس و مشہود ہوتی ہے جو تم اس دُنیا میں دُنیاوی بادشاہوں کی دیکھتے ہو۔ الغرض یہ ایک بیّن حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں ایمان دنیا سے مفقود ہے اور نہ صرف یہ کہ عوام کے دلوں سے مفقود ہے بلکہ وہ لوگ جو مذہبی لیڈر کہلاتے۔ اور لوگوں کو ایمان پر قائم کرنے کا دم بھرتے ہیں ان کے دل بھی دہریت کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ یا تو دھوکہ دیتے ہیں یا خود اپنے متعلق دھوکہ خوردہ ہیں۔ کیونکہ زبان پر تو سب کچھ ہے مگر دل میں کچھ بھی نہیں۔ دنیا ایک خطرناک تاریکی میں گھری ہوئی ہے اور کوئی کمزور۔ مدہم اور ٹمٹماتا ہُوا چراغ بھی کسی کونے میں نظر نہیں آتا جس سے گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے مسافروں کا راستہ تھوڑا بہت روشن ہو سکے کیا ایسے تاریک و تار وقت میں ضرورت نہ تھی کہ خدا کی تجلیات کا سورج اس کے کسی پاک بندے کے افقِ قلب سے طلوع ہو کر دنیا میں اُجالا کرے؟ میرے عزیزو اُٹھو اور اپنی جبینِ نیاز کو آستانہ اُلوہیت پر رکھ دو۔ کیونکہ تمہارے خدا نے تمہاری حالت کو دیکھا۔ اور تمہارے لئے اپنے ایک رُوحانی سُورج کو مشرق سے بلند کر دیا۔ اب اپنے دل کی کھڑکیاں کھولو اور اس سورج کی کرنوں کو اس کے اندر جانے دو۔ تا کہ شکوک و شبہات کی تاریکی دُور ہو۔ اور رات کی ظلمت دن کی روشنی میں بدل جاوے۔

خدا نظر کیوں نہیں آتا

اس کے بعد قبل اس کے کہ میں اصل مضمون کو شروع کروں۔ ایک شبہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو خداوند تعالےٰ کے متعلق عموماً لوگوں کے دلوں میں پیدا ہُوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ یہ شبہ آج کا نہیں بلکہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کے دہریوں نے آنحضرت صلعم سے بھی یہی سوال کیا تھا کہ ہمیں خدا دکھا دو۔ پھر ہم مان لیں گے۔ میں جب کبھی اس شبہ کا ذکر سُنتا یا پڑھتا ہوں۔ تو مجھے اس شبہ کے پیدا کرنے والوں کی حالت پر رحم آتا ہے افسوس جب انسان ٹھوکر کھانے لگتا ہے تو اس کی عقل پر ایسا غفلت کا پردہ آجاتا ہے کہ وہ بیّنات سے انکار کرنے لگ جاتا ہے۔ گذشتہ زمانوں میں اگر یہ اعتراض

ہوتا تھا۔ تو گو لغو اور بیہودہ ہی تھا۔ مگر پھر بھی بعض نادانوں کو عارضی طور پر دھوکے میں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں اس اعتراض کا پیدا ہونا واقعی حیرت انگیز ہے اور مجھے اس دماغ پر سخت تعجب آیا کرتا ہے جو اس قسم کے شبہات سے اپنے انکار میں تسلی پانے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے نزدیک اس قسم کے اعتراضات کا اُٹھانا صرف چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ اور یا پھر یہ مجانین کا کام ہے۔ مگر بہر حال چونکہ یہ ایک عام شبہ ہے اس لئے اس کا ازالہ ضروری ہے۔ چنانچہ میں مختصر طور پر اس کا جواب دے کر اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں +

جاننا چاہیئے۔ کہ دُنیا میں مختلف چیزوں کے متعلق علم حاصل کرنے کے ذرائع مختلف ہیں۔ مثلاً کسی چیز کے متعلق ہمیں دیکھنے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ کسی کے متعلق سُننے سے۔ کسی کے متعلق چکھنے سے کسی کے متعلق سونگھنے سے۔ کسی کے متعلق ٹٹولنے سے۔ اور کسی کے متعلق چھونے سے۔ اور یہ سب علم ایک جیسے ہی یقینی اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم یہ مطالبہ کریں کہ جب تک ہمیں فلاں چیز کے متعلق فلاں ذریعہ سے علم حاصل نہیں ہوگا ہم نہیں مانیں گے مثلاً رنگوں کے متعلق علم حاصل کرنے کا ذریعہ آنکھ ہے یعنی آنکھ کے ذریعہ ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ فلاں رنگ اس قسم کا ہے اور فلاں اس قسم کا۔ اسی طرح بو کے متعلق علم حاصل کرنے کا ذریعہ ناک ہے۔ اور آواز کے لئے کان ہیں۔ اور یہ سراسر دیوانگی ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ جب تک ہم آنکھ کے ذریعہ فلاں خوشبو کو نہیں دیکھ لیں گے ہم نہیں مانیں گے یا جب تک ہم ناک کے ذریعہ فلاں رنگ کو سونگھ نہ سکیں گے ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ یا جب تک ہم فلاں آواز کو ہاتھ سے ٹٹول نہ لیں گے ہماری تسلی نہ ہوگی۔ جو شخص ایسے اعتراضات اُٹھائے گا وہ پاگل کہلائے گا۔ اور اگر وہ پاگل خانہ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ تو کم از کم گلی کے شریر اور شوخ بچوں کا تماشہ ضرور بن جائے گا۔ مگر تعجب ہے کہ خدا تعالےٰ کے متعلق لوگ آئے دن ایسے اعتراضات اُٹھاتے رہتے ہیں۔ اور پھر وہ عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ اور کوئی خدا کا بندہ ان عقل کے اندھوں سے نہیں پوچھتا

کہ آخر اس جنون کی وجہ کیا ہے۔ کیا خدا کی ذات ہی ایسی رہ گئی ہے کہ تم اسے اپنی اس تمسخر آمیز دیوانگی کا نشانہ بناؤ۔ افسوس صد افسوس ÷

یہ میں نے صرف حواس ظاہری کا ذکر کیا ہے جن سے دنیا کی بہت سی چیزوں کے متعلق علم حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں بے شمار چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا علم حواس ظاہری میں سے کسی حس کے ذریعہ بھی براہ راست حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور باوجود اس کے ہمیں ان کے متعلق ایسا ہی یقین حاصل ہے جیسا کہ ان چیزوں کے متعلق ہے جن کا علم حواس ظاہری کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قوتِ مقناطیسی کو لے لو۔ کیا تم اسے آنکھ سے دیکھ سکتے ہو یا کان سے سن سکتے ہو یا ناک سے سونگھ سکتے ہو یا زبان سے چکھ سکتے ہو یا ہاتھ سے ٹٹول یا چھو سکتے ہو؟ ہر گز نہیں۔ مگر کیا تم میں سے کسی کو جرأت ہے کہ اس طاقت کا انکار کرے؟ میں پھر کہوں گا کہ ہر گز نہیں۔ کیونکہ گو تم اس طاقت کو اپنی کسی ظاہری حس سے براہِ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے اثرات و افعال تم یقینی طور پر محسوس کرتے ہو۔ اور اثرات کا علم تمہارے اندر اسی قدر یقینی علم پیدا کر دیتا ہے جیسا کہ خود کسی چیز کا براہ راست محسوس کرنا کر سکتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ جب ایک مقناطیسی لوہے کے قریب تم ایک عام لوہے کا ٹکڑا لاتے ہو تو وہ مقناطیس جھٹ اس لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور جب بھی تم ایسا کرتے ہو یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے جس سے تمہیں یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اس مقناطیسی لوہے کے اندر عام لوہے کے علاوہ کوئی طاقت موجود ہے جسے تم اپنے ظاہری حواس سے براہِ راست محسوس نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے اثرات و افعال سے اس کا پتہ لگاتے ہو۔ اور تمہیں کبھی یہ شبہ نہیں گذرتا۔ کہ چونکہ ہم نے قوتِ مقناطیس کو دیکھا یا سنا یا سونگھا یا چکھا یا ٹٹولا یا چھوا نہیں اس لئے ہم اسے نہیں مان سکتے۔ اسی طرح بجلی کی طاقت ہے جو خود نظر نہیں آتی۔ مگر اپنے اثرات و افعال سے تمہارے دلوں پر حکومت کر رہی ہے۔ تم اپنے کمرے کا بٹن دباتے ہو اور تمہارا پنکھا فر فر چلنے لگ جاتا ہے اور تم محسوس کرتے ہو کہ اب اس پنکھے میں کوئی بیرونی طاقت کام کر رہی ہے جو ایک سیکنڈ قبل اس میں موجود نہ تھی۔ حالانکہ تم نے نہ

اس طاقت کو براہ راست دیکھا نہ سنا نہ سونگھا نہ چکھا۔ اور نہ کسی اور ظاہری حس سے براہ راست اسے معلوم کیا۔ مگر تمہارا دل اس یقین سے پُر ہے کہ بجلی ایک زبردست طاقت ہے کیونکہ گو تمہارے حواس نے براہ راست بجلی کو محسوس نہیں کیا۔ مگر اس کے افعال و اثرات و نتائج کو یقینی طور پر محسوس کیا ہے اس لئے تم اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور اس پر اسی طرح یقین لاتے ہو جیسے مثلاً سورج۔ چاند۔ پہاڑ۔ دریا وغیرہ کے متعلق تمہیں یقین ہے۔ پھر مثلاً محبت کے جذبہ کو لو۔ کوئی ہے جس نے محبت کو دیکھا ہو یا سُنا ہو یا چکھا ہو یا سونگھا ہو یا ٹٹولا ہو یا چھُوا ہو؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو میں کہتا ہوں کہ پھر تم میں سے کوئی ہے جو محبت کا انکار کر سکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے اس مضمون کے پڑھنے والوں میں سے کوئی خاص طور پر عشق کا دلدادہ اور محبت کا درد آشنا بھی ہے یا نہیں لیکن اگر کوئی ہے تو میں اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس نے یہ نظارہ نہیں دیکھا کہ اسکے چھوٹے سے دل میں جو وزن میں شاید آدھ پاؤ سے بھی زیادہ نہیں ہوگا۔ محبت کا ایک ناپیدا کنار اور اتھاہ سمندر موجزن ہے جو جب تلاطم پر آتا ہے تو خدا کی مخلوقات میں غالباً سب سے زیادہ مہیب اور سب سے زیادہ طاقتور ہستی کہلانیکا حقدار ہو جاتا ہے اور جو ایک کمزور اور نحیف انسان کے اندر وہ قوت و زور بھر دیتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر پہاڑ سے ٹکراتا ہے۔ اور صحراؤں کی خاک چھانتا ہے اور جنگل کے درندوں کے مُنہ میں گھس جاتا ہے اور آگ میں زندہ کود جاتا ہے اور سمندر کی مہیب موجوں کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہے مگر پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ راتوں کو جاگتا ہے اور دنکو دیوانہ وار پھرتا ہے اور اپنے زندگی کے خون کو آنکھ کے رستے بہا دیتا ہے مگر دم نہیں مارتا کیا کوئی ہے جو یہ کہہ سکے کہ دنیا میں یہ طاقت موجود نہیں؟ مگر اس عظیم الشان طاقت کو کس نے دیکھا ہے کس نے سنا ہے کس نے سونگھا ہے کس نے چکھا ہے کس نے ٹٹولا ہے کس نے چھُوا ہے؟ اسی طرح وقت زمانہ۔ قوت۔ عقل۔ شہوت۔ غضب۔ رحم وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو تم مانتے ہو مگر جن کو تمہارے حواس ظاہری نے کبھی براہ راست محسوس نہیں کیا +

بات یہ ہے جیسا کہ مَیں نے اوپر بیان کیا ہے دُنیا میں مختلف چیزوں کے متعلق علم حاصل کرنیکے لئے مختلف ذرائع ہیں۔ کسی چیز کا علم دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے کسی کا سننے سے کسی کا سونگھنے سے کسی کا چکھنے سے۔ اور کسی کا دوسری کسی حس کے ذریعہ سے اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا

علم حواس کے ذریعہ براہ راست حاصل ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا علم انکے اثرات وافعال ونتائج کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور یہ سارے علم خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہوں ایک سے ہی یقینی اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک طفلانہ خیال ہے کہ ہم جبتک فلاں چیز کے علم کو فلاں ذریعہ سے حاصل نہ کر سکینگے تب تک اسکے وجود کے قائل نہیں ہونگے۔ اصل مقصود تو حصول علم ہے خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔ اگر وہ حاصل ہو جاتا ہے تو ہمارا مطلب حل ہو گیا۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں تو تب مانونگا کہ مینے فلاں کمرے کو اندر سے دیکھ لیا ہے جبکہ تم اس کمرہ کی چھت پھاڑ کر مجھے اس میں داخل کردگے اور اگر دروازے کے رستے داخل کروگے تو پھر میں نہیں مانونگا؟ ایسے شخص سے میں یہ پوچھونگا کہ تمہارا مقصود چھت کو پھاڑنا ہے یا کمرے کے اندر جانا؟ اگر تم کمرے کے اندر داخل ہو سکتے ہو تو یہ کیا سوال رہا کہ چھت پھاڑ کر اندر کودتے ہو یا دروازہ کے راستے داخل ہوتے ہو۔ آخر جو رستہ کسی کمرہ کے اندر داخل ہونیکے لئے مقرر ہے۔ اسی سے تم اندر جاسکتے ہو اور تمہارا یہ مطالبہ مجنونانہ ہے کہ تمہارے واسطے اسکے اندر جانے کے لئے کوئی ایسا راستہ کھولا جاوے جو تمہاری مرضی کے مطابق ہو۔ اگر تمہاری مرضی مانی جاوے تو زید کی کیوں نہ مانی جاوے۔ اور اگر زید کی مانی جاوے تو بکر کی کیوں نہ مانی جاوے۔ تو گویا مطلب یہ ہوا کہ خدا بھی تمہارے تخیلات کا کھلونہ بنجاوے اور نعوذ باللہ ایک بہروپیہ کی طرح جس طرح کوئی چاہے اسی طرح اپنی صفات بدلتا ہے۔ تاکہ تمہاری ان نازک خیالیوں کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ افسوس مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۔

عزیزو اسبات کو خوب سمجھ لو کہ کوئی چیز جتنی کثیف ہوتی ہے اتنا ہی اس کا ادراک یعنی اس کے متعلق علم حاصل کرنا انسان کے ظاہری حواس کے قریب ہوتا ہے۔ اور جتنی کوئی چیز لطیف ہوتی ہے اتنا ہی اس کا ادراک انسان کے ظاہری حواس سے دُور ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیزیں بہت لطیف ہوتی ہیں انکے ادراک کے لئے عموماً انکے اثرات وافعال ونتائج کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے کیونکہ ان کا ادراک ہمارے حواس کے لئے براہ راست ممکن نہیں ہوتا جیساکہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا جو ایک الطف ترین ہستی ہے بلکہ جو خود دوسری لطیف چیزوں کو پیدا کرنیوالا ہے وہ ان مادی آنکھوں سے نظر آجاوے۔ پس معترض کا یہ کہنا کہ جبتک ہم خدا کو اپنی

ان مادی آنکھوں سے نہ دیکھ لینگے ہم نہیں مانیں گے ایک فضول اور لایعنی بات ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ یا تو معترض کے نزدیک نعوذ باللہ خدا ایک کثیف ہستی ہے۔ اور یا کم از کم اس کا یہ منشاء ہے کہ اسکی خاطر خدا کو کثافت اختیار کر لینی چاہیئے تا کہ وہ اسے اپنی ان آنکھوں سے دیکھ کر تسلی کر سکے مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں لوگ اندھے بھی ہیں۔ تو کیا پھر ان لوگوں کا حق نہیں ہوگا کہ وہ یہ درخواست کریں کہ خدا تعالیٰ ہماری خاطر کوئی ایسی کثافت اختیار کرے جس کے نتیجہ میں ہم اسے سونگھ سکیں یا چکھ سکیں یا ٹٹول سکیں۔ کیا خدا تعالیٰ کے متعلق یہ تمسخرانہ طریقِ تحقیق اختیار کرنا انسان کے واسطے جو دل و دماغ رکھنے کا مدعی بنتا ہے قابل شرم نہیں ہے؟ تم کہتے ہو کہ ہم خدا کو اسوقت تک نہیں مانینگے جبتک ہم اسکو ان ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھ لینگے مگر میں کہتا ہوں کہ اگر خدا ان آنکھوں سے نظر آنے لگے تو میرے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں رہے گا کہ ہم اسپر ایمان لائیں چہ جائیکہ اس کا ماننا ہمارے لئے آسان ہو جاوے کیونکہ اس صورت میں اسکی کئی دوسری صفات کو باطل قرار دینا ہوگا۔ مثلاً وہ لطیف ہے مگر اس صورت میں وہ لطیف نہیں بلکہ کثیف ہو جائیگا۔ وہ غیر محدود ہے مگر اس صورت میں وہ غیر محدود نہیں رہے گا بلکہ محدود ہو جائیگا وغیر ذالک۔ اور پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر خدا تمہاری خاطر یعنی اس لئے کہ تم اسپر ایمان لے آؤ کثافت اور محدودیت اختیار کرے تو تم پھر اس وجہ سے اس کا انکار نہ کرنے لگ جاؤ گے کہ ہم کثیف اور محدود خدا کو نہیں مان سکتے۔ اللہ اللہ کیا ہی مقدس کیا ہی دلربا۔ کیا ہی کامل ہستی ہے جسکی ہر صفت پر اسکی دوسری صفات بطور پہرہ دار کے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ کوئی شخص اسکی کسی صفت پر حملہ آور ہو۔ اور پھر اس کی دوسری صفات بیدار اور فرض شناس سنتریوں کیطرح اس کو خائب و خاسر کر کے ذلّت کے گڑھے میں نہ دھکیل دیں۔ ابھی تم نے دیکھا کہ معترض نے صرف اسکے مخفی ہونے کی صفت کے متعلق شبہ پیدا کیا تھا۔ مگر کسی طرح اسکے لطیف ہونیکی صفت اور اس کے غیر محدود ہونیکی صفت نے فوراً سامنے آکر اس کے اس اعتراض کو پاش پاش کر دیا۔ سچ ہے خدا کا حسن اسی میں ہے کہ وہ مخفی ہو اور پھر آنکھوں کے سامنے رہے وہ باطن ہو اور پھر ظاہر میں نظر آئے۔ وہ لطیف ہو۔ اور پھر مادی چیزوں سے بڑھ کر محسوس و مشہود رہے۔ بد قسمت ہے وہ جس نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ وہ ہلاکت کے منہ میں ہے

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالےٰ کے کمال کا یہی تقاضا ہے کہ وہ لطیف ہو۔ اور ظاہری آنکھوں سے مخفی رہے مگر اس وجہ سے اسکی ذات کے متعلق ہرگز ہرگز کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے شناخت

کرنیکے لئے اس راستہ سے بہت زیادہ یقینی اور قطعی راستے کھلے ہیں جو ہماری ان مادی آنکھوں کو میسر ہیں پس اے عزیز تم اس قسم کے بیہودہ شبہات سے اپنے آپ کو ایمان جیسی قیمتی چیز سے محروم نہ کرو۔ کیا تم ان لوگوں کے نقش پا پر چلو گے جنہوں نے باوجود نہ دیکھنے کے مقناطیس اور بجلی کی طاقتوں کو مانا۔ وقت اور زمانہ کی حکومت کو اپنے اوپر تسلیم کیا۔ شہوت و غضب کے سامنے گردنیں جھکائیں مگر اپنے خالق و مالک کو محبت و عبودیت کا خراج دینے پر رضامند نہ ہوئے؟ نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔

خدا کے متعلق کیوں تحقیق کی جاوے

اب میں اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے متعلق کیوں تحقیق کریں یعنی ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس تحقیق میں پڑیں۔ کہ کوئی خدا ہے یا نہیں اور واقعی جو شخص اللہ تعالےٰ کا قائل نہیں ہے اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہونا ایک حد تک طبعی امر ہے کہ وہ کیوں اس تحقیق میں بلاوجہ اپنا وقت اور توجہ صرف کرے۔ اس لئے سب سے پہلے اس سوال کا جواب ضروری ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ دُنیا کی کسی چیز کی ضرورت یا عدم ضرورت کا دو طرح سے ہی فیصلہ ہوا کرتا ہے۔ اوّل یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو چیز یا کام ہمارے سامنے ہے اسکے اختیار کرنے میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر فائدہ پہنچنے کی معقول طور پر امید کی جا سکتی ہو۔ تو اسے اختیار کیا جاتا ہے ورنہ ترک کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی چیز یا کام کے ترک کرنے میں کسی قسم کے نقصان کا احتمال تو نہیں ہے۔ اگر نقصان کا احتمال نہیں ہے تو اسے اختیار کرنیکی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اور اگر احتمال ہے تو اسے اختیار کیا جاتا ہے۔ پس اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ کسی چیز کے اختیار کرنے میں ہمارے واسطے فائدہ کی امید ہے یا یہ کہ اسکے ترک کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں ہر عقلمند کا یہی فتویٰ ہوگا کہ اسے اختیار کرنا ہمارے لئے نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے اسی اصول کے ماتحت ہم اس ضرورت کے درجہ اہمیت کا بھی فیصلہ کر سکتے ہیں یعنی اگر کسی چیز کا اختیار کرنا ہمارے لئے بہت بڑے فائدہ کی اُمید پیدا کرتا ہے تو اس کا اختیار کرنا اسی نسبت سے ہمارے لئے بہت ضروری ہوگا۔ اسی طرح اگر اسکے ترک کرنے میں بہت بڑے نقصان کا احتمال ہے تو کوئی شخص اسکے ترک کرنیکا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اب آؤ اس اصول کے ماتحت ہم سوال زیر بحث پر نظر ڈالیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں خدا تعالیٰ کے متعلق کسی تحقیق میں پڑنیکی ضرورت ہے یا نہیں۔

یا الفاظ دیگر اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ ہمارا ایک خدا ہے تو کیا اسے مان لینے میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے یا نہیں یا اسکے انکار کر دینے میں ہمارے لئے کسی قسم کے نقصان کا احتمال ہے یا نہیں۔ اس فیصلہ کے لئے ہمیں اس سوال کی نوعیت پر غور کرنا ہوگا۔ جو خدا تعالیٰ کے متعلق ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگر تو خدا کا وجود ہمارے سامنے ایسی صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا ماننا نہ ماننا ہمارے لئے قریباً قریباً برابر ہے اور ہماری زندگی پر اس کا کوئی براہ راست اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ محض ایک علمی سوال ہے تو ظاہر ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو علمی مذاق رکھتے ہیں اور محض علم کی خاطر کسی مسئلہ پر غور کرنیکے عادی ہیں۔ باقی تمام لوگ یہ حق رکھتے ہیں کہ اس تحقیق میں پڑنے سے انکار کر دیں اور اپنی توجہ کو صرف ان باتوں تک محدود رکھیں جو انکی زندگی کے نفع نقصان پر براہ راست اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہمارے سامنے یہ سوال پیش کرے کہ مینے ایک نیا ستارہ دریافت کیا ہے جو زمین سے اتنے کروڑ میل دور ہے اور جس کا ہمارے نظام شمسی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے اور نہ زمین پر اس کا کوئی خاص اثر پڑ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو علم ہیئت میں مذاق رکھتے ہیں کوئی شخص اس ستارے کے حالات وغیرہ دریافت کرنیکی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر فرض کرو کہ کوئی شخص اپنا یہ دعویٰ شائع کرتا ہے کہ مینے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے جس سے انسان کے بدن میں ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکی طبعی عمر بہت لمبی ہو جاتی ہے اور بڑھاپے کے آثار بہت دیر کے بعد اس میں ظاہر ہوتے ہیں اور اوسط عمر جو اس چیز کے استعمال کے بعد انسان پا سکتا ہے ایک سَو برس ہے۔ اور اس دعویٰ کے شائع کرنے والا شخص بھی کوئی ٹھگ اور دھوکہ باز نہ ہو تو تمام دنیا بڑے شوق کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جائیگی کیونکہ یہ تحقیق ایسی ہے کہ اگر یہ درست ثابت ہو تو ہر انسان کی زندگی پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اب ہم خدا کے متعلق دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال تین مختلف جہات سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ سب سے اوّل ہماری فطرت اس سوال کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ دوسرے عقل پیش کرتی ہے۔ تیسرے مذہب پیش کرتا ہے۔ اور یہ تینوں ایسی صورت میں اس سوال کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ہمیں تحقیق کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ سب سے پہلے میں فطرت کو لیتا ہوں۔ ہر شخص جو غور کرنے کا مادہ رکھتا ہے اور بعد کی گندی تربیت نے اسکی فطرت پر ظلمت اور جہالت کے پردے نہیں ڈال دیئے یہ محسوس کریگا کہ اسکی فطرت گا ہے گا ہے

اسکے اندر یہ سوال پیدا کرتی رہتی ہے کہ ممکن ہے میرا کوئی خدا ہو جس نے مجھے پیدا کیا ہو۔ اور جو اس تمام کارخانۂ عالم کا چلانے والا ہو۔ اور اس سوال کے ساتھ ساتھ ہی یہ سوال بھی طبعًا ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمیں کسی نے پیدا کیا ہے اور ہم خود بخود اس دنیا میں نہیں آ گئے تو ضرور ہمارے خالق کے فعل میں کوئی خاص غرض ہوگی اور ضرور ہے کہ اس نے ہماری زندگی کا کوئی مقصد مقرر کیا ہو۔ اس قسم کے سوالات ہر انسان کی فطرت کم وبیش اسکے اندر گاہے گاہے پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس جگہ میں یہ نہیں کہتا کہ فطرت ان سوالات کا کوئی جواب بھی دیتی ہے یا نہیں کیونکہ اسکی بحث آگے آئیگی لیکن بہر حال یہ مسلّم ہے کہ فطرت ان سوالات کو ہمارے اندر اُٹھاتی ضرور رہتی ہے اور اٹھاتی بھی ایسے رنگ میں ہے کہ ہم انہیں لاتعلق کہکر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بیشک ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ تحقیق کے بعد ہم یہ رائے قائم کریں کہ کوئی خدا نہیں ہے بلکہ یہ تمام کارخانہ عالم خود بخود نیست سے ہست میں آیا۔ اور خود بخود چل رہا ہے لیکن خوب سوچ لو کہ ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد ہمیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں رہتا کہ ہم اس تحقیق میں پڑنے سے ہی انکار کر دیں۔ یہی حال عقل انسانی کا ہے عقل بھی خواہ بعد میں یہی فیصلہ کرے کہ کوئی خدا نہیں ہے لیکن ان سوالات کو ضرور ہمارے سامنے بڑے زور کے ساتھ پیش کرتی ہے بلکہ فطرت کی نسبت زیادہ وضاحت اور زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ عقل ہمیں بار بار ہوشیار کرتی اور کہتی ہے کہ دیکھو اور غور کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کوئی خدا ہو جس نے تمہیں کسی خاص مقصد کے ماتحت اس دُنیا میں بھیجا ہو اور تم اپنے اس خدا اور اپنی زندگی کے اس مقصد سے غافل رہو اور غفلت کی حالت میں ہی تم پر موت آجاوے۔ اُٹھو اور اگر کوئی خدا ہے تو اسے تلاش کرو۔ سوچو اور غور کرو کہ کیا تمہارا اس دُنیا میں آنا صرف اس لئے ہے کہ تم کھاؤ اور پیو اور اپنی جسمانی لذات کو پورا کرنیکی فکر میں پڑے رہو اور جب موت کا وقت آئے تو تم مرجاؤ۔ اور اپنے پیچھے اپنے بچّوں کو چھوڑ جاؤ جو پھر تمہاری طرح دنیا کی سٹیج پر جسمانی لذات کا ڈراما شروع کر دیں۔ اپنی آنکھوں کو کھولو اور دیکھو کہ کیا تم خود بخود نیست سے ہست میں آ گئے ہو؟ کیا تمہارے جسموں کا یہ نہایت مفصل باریک اور حکیمانہ نظام اپنا خالق آپ ہی ہے؟ کیا یہ تمام کارخانہ عالم اپنے اس مدبرانہ قانون کے ساتھ جو تم اسکے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں کام کرتے دیکھتے ہو کسی اتفاق کا نتیجہ ہے؟ اور اگر ایسا نہیں بلکہ یہ سب کچھ کسی بالا ہستی کی قدرتوں کا کرشمہ ہے۔ تو کیا اس ہستی نے اسے ایک کھلونے کے طور پر پیدا کیا ہے جس کا سوائے اسکے

کوئی مقصد نہیں ہے کہ اسکی لذت آشنا آنکھیں اپنی قدرت کے اس نظارہ کو دیکھیں اور جب وہ اس لذت و سرور سے سیر ہوجائیں تو پھر اس کا ہاتھ اس وسیع عالم کو اپنی ایک حرکت سے حرف غلط کی طرح میٹ دے اور کوئی نیا کھلونا تیار کرنے میں لگ جاوے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہو اور اس نے اپنے دنیوی اعمال کے متعلق کبھی کسی کے سامنے کھڑے ہوکر جوابدہ ہونا ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر صحیح الدماغ انسان کی عقل بار بار اسکے سامنے پیش کرتی رہتی ہے اب انصاف سے بتاؤ کہ کیا یہ سوالات ایسے ہیں کہ تم انکو لاتعلق اور غیر ضروری قرار دیکر خاموش ہو جاؤ؟ میں یہ نہیں کہتا کہ تم ان سوالات کا یہ جواب دو یا وہ جواب دو۔ کیونکہ جواب دینا ہر شخص کی اپنی تحقیق کے نتیجہ پر مبنی ہے جسکے متعلق تو تحقیق کرنیوالا ابھی پیش از وقت نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا ہوگا مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جس رنگ میں یہ سوال تمہارے سامنے آتا ہے اس کا یہ تقاضا ہے کہ تم اپنی پوری توجہ کے ساتھ اس مسئلے کی تحقیق میں لگ جاؤ اور اس وقت تک چین نہ لو جبتک کہ تمہاری آزاد اور دیانتدارانہ تحقیق تمہیں کسی نتیجہ تک نہ پہنچادے۔ خلاصہ کلام یہ کہ فطرت اور عقل انسانی ہر دو ہستی باریتعالیٰ کے سوال کو ایسے رنگ میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ہم اس تحقیق میں پڑنے سے قطعاً انکار نہیں کرسکتے۔ کیا یہ سوال ہمارے لئے ایک لاتعلق سوال ہے کہ ہمارا کوئی پیدا کرنیوالا ہے یا نہیں؟ کیا یہ سوال ہمارے لئے ایک لاتعلق سوال ہے کہ اگر ہمیں کسی نے پیدا کیا ہے تو وہ کون ہے کہاں ہے کیا کیا صفت رکھتا ہے؟ کیا یہ سوال ہمارے لئے ایک لاتعلق سوال ہے کہ اگر ہمیں کسی نے پیدا کیا ہے تو ہماری پیدائش کی غرض کیا ہے؟ کیا یہ سوال ہمارے لئے ایک لاتعلق سوال ہے کہ اگر ہماری پیدائش کی کوئی غرض ہے تو وہ غرض کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟ اگر یہ سوالات لاتعلق نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں تو کون عقلمند ہے جو اس تحقیق میں پڑنے سے انکار کرسکتا ہے؟ ✧

تیسرے درجہ پر مذہب ہے۔ دنیا میں جس قدر بھی مذہب پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی ہستی کے سوال کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ ان کی تعلیم کا مرکزی نقطہ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات ہے۔ اور چونکہ تمام مذاہب جو دنیا میں قائم ہوکر لاکھوں انسانوں کی قبولیت حاصل کرچکے ہیں اپنی اصل کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہیں اور انکی بنیاد الہام الٰہی پر ہے جو مختلف زمانوں میں نازل ہوکر دنیا کو منور کرتا رہا ہے۔ اس لئے باوجود اسکے

کہ ان مذاہب کی تعلیمات بعد کی انسانی دست و بُرد سے بہت کچھ محرف و مبدّل ہو چکی ہوں پھر بھی چونکہ انکی بنیاد کلام الٰہی پر ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق فطرت اور عقل کے اشارات کی نسبت بہت زیادہ وضاحت اور تفصیل اور تعیین پائی جاتی ہے۔ گویا عقل اور فطرت کے اجمال کو الہام نے اپنی تفسیر سے کھول دیا ہے۔ علاوہ ازیں مذہب بخلاف فطرت و عقل کے ہمیں صرف یہ نہیں کہتا کہ ممکن ہے کوئی خدا ہو یا یہ کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے۔ بلکہ وہ معیّن طور پر ہمیں یہ بتاتا ہے کہ واقعی ہمارا ایک خدا ہے جو ہمارا خالق و مالک ہے اور جس نے ہمیں ایک غرض اور مقصد کے ماتحت اس دُنیا میں بھیجا ہے۔ دُنیا کے مختلف مذاہب کی تعلیم میں خواہ کتنا بھی اختلاف ہو اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس کارخانۂ عالم کا ایک خالق و مالک ہے جسکے قبضہ تصرف میں ہماری جانیں ہیں اور یہ کہ ہمارے اس خدا نے ہماری زندگیوں کا ایک مقصد مقرر کیا ہے جسکے حصول کا طریق بھی اس نے خود ہمیں بتا دیا ہے اور یہ کہ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان اپنی اس زندگی کے اعمال کا ثمرہ پائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مذاہب کی یہ متفقہ شہادت ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوال کو ایسے رنگ میں پیش کرتی ہے کہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس تحقیق میں پڑ کر کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ کیونکہ جو باتیں خدا تعالیٰ کے متعلّق یہ مذاہب ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اگر وہ درست ہوں تو ہمارا اس خدا سے غافل رہنا تمام ان نقصانات سے بڑھ کر ہے جو ہمیں اس دُنیا میں ممکن طور پر پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اس غفلت کے یہ معنی ہیں کہ گویا ہماری ساری زندگی ہی اکارت چلی گئی۔ اور اس کو شناخت کرنا اور اسکے ساتھ تعلق پیدا کرنا تمام ان فوائد سے بڑھ کر ہے جو ہمیں اس دنیا میں ممکن طور پر حاصل ہو سکتے ہیں کیونکہ اس تعلق کے یہ معنی ہیں کہ جس غرض کے لئے ہم اس دُنیا میں بھیجے گئے تھے وہ غرض ہمیں حاصل ہو گئی۔ اور ہم نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا۔ پس خدا تعالیٰ کے متعلق تحقیق کرنے کا سوال ایک ایسا اہم سوال ہے جسے کوئی عقلمند ایک لمحہ کیلئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا +

مذاہب کی اس متفقہ شہادت کے بعد میں اسلام کی مخصوص تعلیم کے متعلّق بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں سو اے میرے عزیزو خوب کان کھولکر سُن لو کہ اسلام تم سے یہ کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو تمہارا خالق و مالک ہے یعنی جو تمہیں نیست سے ہست میں لایا ہے اور جسکے قبضہ تصرف میں تمہاری جانیں ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو ربّ ہے یعنی جو تمہاری ہر قسم کی ترقی اور بہبودی کا سا

مہیا کر کے تمہیں کسی اعلیٰ مقام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو رحمٰن ہے یعنی جو تمہاری اہم ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے خود تمہارے لئے تمہاری ان ضروریات کو مہیا کرتا ہے بغیر اسکے کہ تم اس سے سوال کرو اور بغیر اسکے کہ تم ان ضروریات کے پورا کرنیکے لئے کسی قسم کی محنت برداشت کرو۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے۔ جو رحیم ہے یعنی وہ تمہاری کوششوں کا بہتر بن ثمرہ پیدا کرتا ہے اور کسی کوشش کو ضائع نہیں جانے دیتا۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو مالک یوم الدین ہے یعنی جو تمہارے اعمال پر جزا و سزا مترتب کرتا ہے اور جب کوئی شخص غلط راستہ پر چلتا ہے تو اُسے غلط طریق کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں تا کہ وہ ہوشیار رہے اور غافل نہ ہونے پاوے۔ اور تا کہ وہ اپنی زندگی کے اس مقصد کو بھول نہ جائے جو خدا نے اسکے لئے مقرر کیا ہے کیونکہ اس نے ایک دن مر کر خدا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو غفور ہے یعنی جب تم خدا کے راستہ میں کوشش کرتے ہو تو جو لغزشیں اور کمزوریاں تم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں ان پر وہ پردہ ڈالتا رہتا ہے۔ اور تمہاری کوششوں کا خیال رکھتے ہوئے تمہیں ان کمزوریوں کے بد اثرات سے بچاتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو توّاب ہے یعنی جب تم سے کوئی گناہ ہوتا ہے اور پھر تم سچے دل سے اس پر پشیمان ہوتے ہو اور تمہاری طبیعت ایک دلی تڑپ کے ساتھ غلط راستہ کے ترک کرنے اور ٹھیک راستہ کے اختیار کرنیکی طرف مائل ہوتی ہے اور آیندہ کے لئے تم نیک نیتی کے ساتھ اس گناہ کے اثر کو مٹانے اور نیک اعمال کے بجالانے کا طریق اختیار کرتے ہو اور اپنے لئے ایک موت کو قبول کر کے آیندہ کے واسطے ایک نیا آدمی بننے کا عہد کرتے ہو تو خدا بھی تمہاری مدد کے لئے اُترتا ہے اور تمہاری توبہ کو قبول کر کے تمہارے اس گناہ پر اپنی بخشش کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو قادر مطلق ہے یعنی کوئی کام جو قدرت کے نام سے موسوم ہو سکتا ہے اسکی طاقت سے باہر نہیں ہے خواہ تمہاری نظر میں وہ کیسا ہی مشکل اور ناممکن نظر آئے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو سمیع ہے یعنی وہ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے اور کوئی آواز نہیں جو اس تک نہ پہنچ سکے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو علیم ہے یعنی کوئی بات یا کوئی خیال یا کوئی چیز خواہ وہ پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے اسکے علم سے باہر نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو ناصر ہے

یعنی تمہاری تمام ضرورتوں کے وقت اور تمام تکلیفات کے وقت وہ تمہاری نصرت فرماتا ہے بشرطیکہ تم اسکے ساتھ تعلق پیدا کرو۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو ازلی ابدی ہے یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور زمانہ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو جمیل ہے یعنی وہ تمام خوبصورتیوں اور تمام حسنوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس قابل ہے کہ انسان اپنی محبت کے پھول اسکے قدموں پر رکھے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو ودود ہے یعنی وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہیں انکے ساتھ وہ سب محبت کرنیوالوں سے بڑھ کر محبت اور وفاداری دکھاتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جو متکلم ہے یعنی وہ اپنے تعلق رکھنے والوں کو اپنی ہمکلامی کا شرف عطا کرتا ہے اور گو بوجہ لطیف ہونیکے وہ ان مادی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا لیکن جو لوگ اسکے عشق کی آگ اپنے سینوں میں دبی رکھتے ہیں انپر وہ اپنے محبوبانہ کلام کے پانی کا چھینٹا ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ اس عشق کی آگ میں جلکر خاک ہی نہ ہو جائیں۔ ایک عاشق بار یتعالیٰ نے کہا ہے اور کیا ہی خوب کہا ہے ؎

میں تو جلکر خاک ہوتا گر نہ ہوتا تیرا لطف
پھر خدا جانے کہاں یہ پھینکدی جاتی غبار

عزیزو یہ وہ خدا ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ میں فی الحال تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم اس خدا پر ایمان لے آؤ۔ مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اسلام کہتا ہے کہ تمہارا ایک خدا ہے جسکی یہ یہ صفات ہیں اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تم تلاش اور کوشش کے ساتھ اس خدا تک پہنچ سکتے ہو۔ کیا تم اس تلاش اور اس تحقیق کو ایک غیر ضروری اور لاتعلق بات قرار دوگے؟ اگر تم ایسا کروگے تو تم یہ ثابت کردوگے کہ تمہارے سر میں وہ جوہر نہیں ہے جسے عقل کہتے ہیں۔ اور تمہارے سینے میں دل نہیں ہے بلکہ پتھر ہے عزیزو اٹھو اور اس خدا کی تلاش میں لگ جاؤ۔ اٹھو اور اس چشمہ کیطرف بھاگو جو تمہاری زندگی کا چشمہ ہے۔ اٹھو اور اس خزانہ کیطرف بڑھو جو تمہیں دنیا و مافیہا سے غنی کردے گا۔ اگر تم نے اسے پالیا تو میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم نے کیا پایا۔ ایک خدا رسیدہ کے منہ سے سنو۔ وہ کیا کہتا ہے:۔

تجھے سب زور و قدرت ہے خدایا
تجھے پایا ہر اک مقصد کو پایا
ہر اک عاشق نے ہے اک بت بنایا
ہمارے دل میں یہ دلبر سمایا

وہی آرام جاں اور دل کو بھایا
ہُوا ظاہر وہ مجھ پر بالایادی
مجھے اس یار سے پیوند جاں ہے
بیاں اس کا کروں طاقت کہاں ہے
یہ کیا احساں تیرے ہیں میرے ہادی
تری رحمت کی کچھ قلت نہیں ہے
شمار فضل اور رحمت نہیں ہے
یہ کیا احساں ہیں تیرے میرے ہادی

وہی جسکو کہیں رب البرایا
فسبحان الذی اخزی الاعادی
وہی جنّت وہی دارالاماں ہے
محبت کا تو اک دریا رواں ہے
فسبحان الذی اخزی الاعادی
تہی اس سے کوئی ساعت نہیں ہے
مجھے اب شکر کی طاقت نہیں ہے
فسبحان الذی اخزی الاعادی

اور اگر تم ناکام رہے تو خود تمہاری ناکامی تمہارے لئے اس بات کی دلیل ہوگی کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے کیونکہ جو چیز اتفاق کا نتیجہ ہے اس کا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ تو اس صورت میں بہرحال تم نے کسی نہ کسی کام میں بے مقصد طور پر اپنی زندگی کے دن کاٹنے تھے تم یہ سمجھ لینا کہ تم نے اپنی یہ بے مقصد زندگی اس کوشش میں صرف کر دی کہ اس کا کوئی مقصد تلاش کیا جاوے کیا یہ شکست تمام ان فتوحات سے بڑھ کر رہے گی جو تم ابتی اس بے مقصد زندگی میں بے مقصد طور پر حاصل کرتے؟ مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ تم ہرگز ناکام نہیں رہ سکتے تم اس میدان میں پاک نیت اور دلی محبت اور سچی تڑپ کے ساتھ نکلو اور تم دیکھو گے کہ کامیابی کی خوش کن ہوائیں بہت جلد تمہارا خیر مقدم کرتی ہوئی تم سے آملینگی۔ کیا تم نے نہیں سنا؟ ؎

تجھے دُنیا میں کس نے ہے پکارا
تو پھر ہے کس قدر اس کو سہارا

کہ پھر خالی گیا قسمت کا مارا
کہ جس کا تُو ہی ہے سب سے پیارا

خدا کے متعلق طریق تحقیق

اب میں نہایت مختصر طور پر یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ خداوند تعالےٰ کے متعلق تحقیق کا طریق کیا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جبتک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ کسی چیز کے متعلق تحقیق کا طریق کیا ہے اس وقت تک کامیابی نہایت مشکل ہے۔ ایک غلط طریق کو اختیار کر کے ہم اپنی ساری کوشش بلاسود ضائع کر سکتے ہیں ایک شخص جو زمین میں کنواں کھود کر پانی نکالنا چاہتا ہے کبھی پانی تک نہیں پہنچ سکتا جبتک کہ وہ خاص

خطہ زمین کو منتخب کر کے خاص قواعد کے ماتحت زمین کو عمودی شکل میں کھودتا ہؤا نیچے نہ اُتر جاوے اگر وہ زمین کو عمودی شکل میں نہیں کھودیگا بلکہ سطح زمین کے متوازی کھودنا شروع کریگا تو خواہ وہ ۲ دو میل تک کھودتا ہؤا چلا جاوے وہ کبھی پانی کی شکل نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ اس نے پانی تک پہنچنے کا غلط طریق اختیار کیا ہے اور بعد میں اس کا یہ شکایت کرنا کہ دیکھو مینے اتنی محنت اور عرق ریزی کی ہے اور پھر بھی مجھے پانی نہیں ملا ایک غلط اور بیہودہ عذر ہوگا جو کسی عقلمند کے نزدیک مسموع نہیں ہوسکتا پس معلوم ہؤا کہ صرف محنت اور کوشش کوئی حقیقت نہیں رکھتیں جبتک کہ وہ صحیح طریق پر صرف نہ کی جاویں۔ اور جس طرح ہم دنیا کے تمام کاموں میں دیکھتے ہیں کہ قانونِ قدرت کے ماتحت ہر کام کے لئے ایک خاص طریق مقرر ہے جسکے بغیر وہ کام سرانجام نہیں پاسکتا۔ اسی طرح روحانی امور میں بھی ہر مقصد کے حصول کے واسطے ایک راستہ اور طریق مقرر ہے جسے اختیار کرنیکے بغیر ہم اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے خواہ ہم کتنی بھی محنت اور توجہ صرف کریں۔ اور اس ضابطہ اور قانون کا وجود سراسر ہمارے فائدہ کے واسطے ہے کیونکہ اسکے بغیر انسان کی علمی اور عملی ترقی محال ہے۔ فرض کرو کہ اگر دُنیا میں کوئی قانون نہ ہو اور بغیر ایک خاص طریق پر محنت کرنیکے انسان محض خواہش سے ایک چیز کو حاصل کر سکے تو دنیا کا کیا حشر ہو کیا علم اور محنت اور کوشش اور تجربہ کی جگہ جہالت اور سستی اور کاہلی اور اتکال کا دَور دورہ نہ شروع ہو جاوے؟ کیا عالم اور جاہل جفاکش اور کاہل محنتی اور سُست۔ تجربہ کار اور اناڑی میں کوئی امتیاز اور فرق باقی رہ جاوے؟ کیا انسان کی دماغی ترقی کا راستہ بالکل مسدود نہ ہو جاوے؟ کیا انسان کے اعلیٰ اخلاق کی عمارت دیکھتے دیکھتے مسمار ہو کر خاک میں نہ ملجاوے؟ خوب سوچ لو کہ یہ جو انسان کی جسمانی اور علمی اور عملی اور اخلاقی اور روحانی ترقی اب ہمیں نظر آتی ہے یہ ساری اسی بات کی طفیل ہے کہ دنیا ایک قانون کے ماتحت ہے اور ہر مقصد کے حصول کے واسطے ایک طریق مقرر ہے جسکے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس قانون کو الگ کر دو اور تم دیکھو گے کہ یک لخت تمام ترقیات کا دروازہ بند ہو کر انسانی دماغ ایک منجمد پتھر کی صورت اختیار کر لیگا اور وہ ہستی جو اشرف المخلوقات کہلاتی ہے ایک آن کی آن میں دنیا کی حقیر ترین مخلوق سے بھی نیچے گر جاویگی۔ پس اس قانون کو اپنے رستہ میں ایک روک نہ سمجھو کیونکہ یہ تو پَر ہیں جو خالق کائنات نے علم و عمل کی بلند چوٹیوں تک پرواز کر کے پہنچنے کے واسطے تمہیں عطا کئے ہیں

یہ وہ آفتاب ہدایت ہے جو تمہیں آیندہ ترقیات کا راستہ دکھانے کیلئے تمہارے مہربان آقا نے چڑھا رکھا ہے۔ یہ وہ امتحان ہے جو عالم کو جاہل سے۔ عامل کو بے عمل سے تجربہ کار کو اناڑی سے محنتی کو کاہل سے ممتاز کرنیکے لئے مقرر کیا گیا ہے +

اب سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ جب کوئی آدمی کسی کام کو شروع کرنے لگتا ہے تو جس نیت کے ساتھ وہ اس کام کو شروع کرتا ہے وہ اسکے آیندہ طریق عمل پر ایک بڑی حد تک اثر ڈالتی ہے ایک ہی کام جب ایک نیت سے کیا جاتا ہے تو وہ اور رنگ رکھتا۔ اور اور اثر پیدا کرتا ہے۔ اور وہی کام جب دوسری نیت سے کیا جاتا ہے تو بالکل دوسرے رنگ میں ظاہر ہوتا۔ اور دوسرا اثر پیدا کرتا ہے۔ الغرض نیت کو انسان کے ہر کام میں بڑا دخل ہے اور نیت کا اثر انسان کے تمام کاموں میں ضرور کسی نہ کسی صورت میں رونما ہوتا ہے اور یہ اثر کوئی فرضی اور خیالی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ واقعی اور حقیقی اثر ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک انسان اپنے افسر کی جسکے ماتحت وہ رکھا گیا ہے صرف اس لئے اطاعت کرتا ہے کہ وہ اس کا افسر ہے مگر اسکے احکام میں اسے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں اور نہ اس افسر کے ساتھ اسے کوئی ذاتی محبت کا تعلق ہے اور نہ اس افسر کی لیاقت اور قابلیت کا اس کے دل پر کوئی اثر ہے تو ایسی صورت میں اسکی اطاعت محض ایک ضابطہ کی اطاعت ہوگی۔ اور وہ صرف اپنے فرض منصبی کو پورا کرنیکے لئے اسکے احکام کی تعمیل کریگا۔ اور اسکے کاموں میں کوئی شوق اور ولولہ اور دلچسپی نہیں نظر آئیگی۔ لیکن اگر وہی شخص اپنے افسر کے ساتھ ذاتی محبت کا تعلق رکھتا ہو۔ اور اسکی لیاقت اور قابلیت کا مداح ہو اور اسکے احکام میں دلچسپی رکھتا ہو تو پھر اسکی اطاعت بالکل ہی اور صورت میں ظاہر ہوگی۔ اور اس کا کام کرنیکا طریق بالکل ہی نرالا ہوگا۔ اور اسکے ہر حرکت وسکون میں شوق اور ولولہ اور ایک ذاتی لگاؤ کا رنگ نظر آئے گا۔ اور یہ فرق اس لئے ہوگا کہ گو کام ایک ہی ہے یعنی اطاعت لیکن نیتیں مختلف ہیں اور نیتوں کے اختلاف نے طریق عمل کی صورت کو بدل دیا ہے۔ اسی طرح خدا کے متعلق تحقیق کرنے کا سوال ہے۔ ایک فلسفی بھی تحقیق کرتا ہے اور ایک سالک بھی۔ اور دونوں کا مقصود ایک ہی ہے کہ خدا کا پتہ لگائیں لیکن نیتوں میں فرق ہے۔ فلسفی تو اس لئے اس میدان میں قدم زن ہوتا ہے کہ اپنی عقل کی امداد سے صحیفۂ عالم پر نظر ڈالکر یہ پتہ لے۔ کہ آیا کوئی اس کارخانۂ عالم کا بنانے والا بھی ہے یا نہیں۔ اور پھر جس نتیجہ

پر وہ پہنچے اسے اپنی علمی معلومات کے خزانہ میں جمع کر دے اور بس۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ خدا ہے تو کن صفات والا ہے اس کا اپنے بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے اور بندوں کا اسکے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا مقصود خدا کا تعلق نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ علمی طور پر پتہ لگائے کہ کوئی اس کارخانہ عالم کا صانع بھی ہے یا نہیں۔ وہ اسکے تعلق کا خواہشمند نہیں۔ اسکے قرب کا شائق نہیں اسکی دوستی کا خواہاں نہیں۔ اسکے دل میں اس تک پہنچنے کی تڑپ نہیں۔ اسکی مرضی کا علم حاصل کر کے اسے بجالانے کا اسے خیال نہیں۔ بس ایک علمی تحقیق ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف سالک ہے جو خدا کے لئے سرگردان ہے اسکے تعلق کا خواہشمند ہے اسکے قرب کا شائق ہے اسکی دوستی کا خواہاں ہے اس تک پہنچنے کے واسطے بے قرار ہے۔ اور اسکی رضا کا علم حاصل کر کے اسپر کاربند ہونا چاہتا ہے اور ایک سچی تڑپ کے ساتھ اسکی تلاش کرتا ہے کیا ان دونو کی تلاش ایک رنگ کی ہوگی؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ پس سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی نیت کو درست کرے اور ایک فلسفی کے طور پر نہیں بلکہ ایک سالک کے طور پر اس میدان میں قدم زن ہو اور اپنے دل میں اس تڑپ اور اس بے چینی کو پیدا کرے جو صداقت کی تلاش کے لئے ضروری ہے دیکھو ماں کا دودھ اسکے پستانوں میں اس طرح نہیں اُترتا کہ بچہ ایک معقول اور سنجیدہ صورت بنا کر ماں کے سامنے اس بات کا اظہار کرے کہ اے میری ماں میں تیرا دودھ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا وہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ بچہ جب بھوک سے روتا اور بلبلاتا ہے۔ تو اُس وقت ماں اگر اپنے آپ کو روکنا بھی چاہے تو نہیں رُک سکتی۔ اور بے اختیار ہو کر اسکے پستانوں سے دودھ بہنے لگ جاتا ہے تاکہ وہ دودھ بچے کے جسم کی خوراک بنکر اسے ہلاکت سے بچالے۔ پس خدا بھی اپنا چہرہ فلسفی پر نہیں ظاہر کرتا۔ بلکہ اس سے دُور بھاگتا ہے کیونکہ وہ فلسفیوں کے تخیلات کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔ مگر سالک کے پاس خدا خود آتا ہے کیونکہ وہ ماں سے زیادہ محبت کرنیوالا اور وفادار خدا ہے اور نہیں چاہتا کہ اسکی سچی تلاش رکھنے والا اسکے متعلق تاریکی میں رہ کر ہلاک ہو جاوے۔ یہ بھی ایک عجیب نظارہ ہے فلسفی بھی تلاش کرتا ہے اور سالک بھی مگر فلسفی سے وہ دور بھاگتا ہے اور سالک کے پاس خود بھاگتا ہوا آتا ہے۔ پس اے میرے عزیزو تم خدا کے متعلق کبھی بھی فلسفیانہ طریق تحقیق اختیار نہ کرو کیونکہ اس طرح تم خدا کو کبھی نہیں پا سکتے اور یہ تلاش بے بھی بے سود۔

کیونکہ اگر ہم نے محض علمی طور پر خدا کے وجود کا پتا لگا کر پھر خاموش ہو جانا ہے تو ہمیں اس مصیبت میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم جو اپنا وقت اور توجہ اور طاقت خرچ کریں تو کیا صرف اس لئے کہ ہمیں یہ علم حاصل ہو جاوے کہ کوئی خدا ہے یا نہیں اور بس؟ ایسا علم ہمارے واسطے ذرہ بھر بھی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اُلٹا نقصان دہ ہوگا کیونکہ خدا کا علم پا کر پھر اس سے غافل رہنا ہمیں دُہرا مجرم بنادیگا۔ اسی لئے ہماری اس قسم کی کوشش کے نتیجہ میں خدا کبھی بھی اپنا چہرہ ہم پر ظاہر نہیں کریگا بلکہ وہ صرف اسی صورت میں ہم پر ظاہر ہوگا جب وہ یہ دیکھے گا کہ ہم ایک سچی تڑپ کے ساتھ اس تک پہنچنا چاہتے ہیں تا کہ اس کے قرب کی برکات سے مستفید ہوں۔ اور اسکے ساتھ ایک ذاتی تعلق پیدا کر کے اپنے لئے اعلیٰ ترقیات کا دروازہ کھول سکیں جو انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ پس سچی تڑپ اور دلی ولولہ پیدا کرو تا کہ تمہاری کوششیں بار آور ہوں اور تمہاری محنت کسی ٹھکانے لگے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

کوئی رہ نزدیک تر راہِ محبت سے نہیں ؎ طے کریں اس راہ سے سالک ہزاروں دشتِ خار
اس کے پانے کا یہی اے دوستو اک راز ہے ؎ کیمیا ہے جس سے ہاتھ آ جائیگا زر بے شمار
تیر تاثیر محبت کا خطا جاتا نہیں ؎ تیر انداز و نہ ہونا سست اس میں زینہار
ہے یہی اک آگ تا تم کو بچائے آگ سے ؎ ہے یہی پانی کہ نکلیں جس سے صدہا آبشار
اس سے خود آ کر ملے گا تم سے وہ یارِ ازل ؎ اس سے تم عرفانِ حق سے پہنو گے پھولوں کے ہار

نیز فرماتے ہیں:۔

فلسفی کز عقل مے جوید ترا دیوانہ ہست ؎ دُور تر ہست از خردہا آں رہِ پنہان تو

ایمان باللہ کے مراتب

اس کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چونکہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات وراء الوراء ہے اور بوجہ اپنی کمال لطافت اور غیر محدود ہونیکے انسان کی مادی آنکھوں کے احاطہ سے باہر ہے۔ اور دوسری طرف ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی کوئی زیادہ فائدہ بخش سکتا ہے جبتک خدا کے متعلق انسان کم از کم اس درجہ کا یقین نہ پیدا کرلے۔ جیسا کہ دُنیا کی مادی چیزوں کے متعلق اسے حاصل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کیمانہ قدرت سے یہ مقدر کر رکھا ہے کہ ایک حد تک تو انسان اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھائے اور اسکے بعد خدا خود انسان کیطرف نزول فرما کر اسے اوپر اُٹھالے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے ایمان کو دو حصوں میں

تقسیم کیا ہے۔ایک وہ ایمان جہاں تک انسان خود اپنی خداداد عقل کی مدد سے پہنچ سکتا ہے اور دوسرے وہ ایمان ہے جہاں تک مجرد عقل کی پہنچ نہیں بلکہ اس مقام کے واسطے عقل کی امداد کے لئے آسمان سے بعض اور چیزوں کا نزول ہوتا ہے اور تب جاکر انسان اس ایمان کو حاصل کر سکتا ہے۔چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۝ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے انسان تیری بصارت مجھ تک پہنچنے اور میرا علم اور عرفان حاصل کرنے سے عاجز ہے اس لئے مَیں نے یہ انتظام کیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو تیری بصارت تک پہنچاتا ہوں اور خود اپنی طرف سے ایسا انتظام کرتا ہوں کہ تو میرا علم اور عرفان حاصل کر سکے۔کیونکہ اگر میں لطیف ہونیکی وجہ سے تیرے احاطۂ نظر سے باہر ہوں تو میں خبیر بھی تو ہوں اور جانتا ہوں کہ تیری روحانی زندگی میرے عرفان کے بغیر ناممکن ہے پس میں خود اپنی طرف سے ایسے سامان پیدا کرتا ہوں کہ باوجود میرے لطیف ہونیکے تجھے میرا عرفان حاصل ہوسکے" گویا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے مقابل میں صفتِ لطیف کو رکھا ہے۔یعنی عقل کے ذریعہ خدا کا ادراک اس لئے ناممکن ہے کہ وہ لطیف ہے۔اور وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کے مقابل میں خبیر کو رکھا ہے۔یعنی خدا خود اپنے پہچانے جانے کا انتظام کرتا ہے کیونکہ وہ خبیر ہے۔گویا اللہ تعالیٰ کی یہ دو مقدم الذکر صفات اسکی دو موخر الذکر صفات کا علی الترتیب نتیجہ ہیں اب ایک طرف تو قرآن شریف کی یہ تعلیم ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں بار بار لوگوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اس کائنات اور زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات پر غور کرو۔اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ مع اپنے حکیمانہ نظام کے محض اتفاق کا نتیجہ ہو سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ سارا نظام عالم پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ ضرور اس کا کوئی پیدا کرنیوالا ہونا چاہیئے۔گویا اس طرح قرآن شریف انسان کو بار بار ہستی باریتعالیٰ کے سوال پر غور کرنے اور مخلوقات سے خالق کی ہستی کا پتہ لگانیکی طرف متوجہ کرتا ہے اور یہ طریق استدلال ایسا ہے کہ اسکے متعلق محض عقل ہی کافی ہے کسی آسمانی موید کی ضرورت نہیں حالانکہ آیت محولہ بالا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خدا کا ادراک انسانی بصارت کی طاقت سے باہر ہے اور اسی لئے خدا خود آسمان سے ایسا انتظام فرماتا ہے کہ جسکی مدد سے انسان خدا کا علم اور عرفان حاصل کر سکے۔اور یہ دونوں باتیں بظاہر ایک قسم

کے تضاد کا رنگ رکھتی ہیں۔ مگر غور کیا جاوے تو یہ کوئی تضاد نہیں بلکہ دونو باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں یہ بھی درست ہے کہ انسان خداداد عقل کی امداد سے خدا کیطرف راہ پا سکتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ انسانی عقل مجرد طور پر خدا کا علم اور عرفان حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اسکے لئے ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ خود آسمان سے آیات اور مؤیدات سے اسکی امداد فرمائے اس عقدہ کا حل اس طرح پر ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ ایمان باللہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ابتدائی مرتبہ وہ ہے جس کا حصول مجرد عقل کی امداد سے ممکن ہے اور دوسرا مرتبہ وہ ہے (اور دراصل شرعی اصطلاح میں ایمان باللہ اسی مرتبہ کا نام ہے) جس کا حصول مجرد عقل سے ناممکن ہے بلکہ اسکے واسطے عقل کی امداد کیلئے خدا کی طرف سے خود خاص انتظام ہوتا ہے۔ پہلا مرتبہ ایمان کا جو عقل سے حاصل ہو سکتا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ ہم عقلی دلائل سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ کائنات عالم کا کوئی خالق و مالک **ہونا چاہیئے** کیونکہ یہ سب کچھ جو ہم زمین و آسمان میں دیکھتے ہیں بغیر کسی خالق و مالک کے خود بخود کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ وغیر ذالک اور دوسرا مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ واقعی وہ خالق و مالک موجود بھی **ہے** اور اسکی یہ یہ صفات ہیں اور اس تک انسان اس طرح پہنچ سکتا ہے۔ گویا ایک مرتبہ **ہونا چاہیئے** کا ہے اور دوسرا **ہے** کا۔ اب خوب سوچ لو کہ مجرد عقل کبھی بھی ہمیں **ہے** کے مرتبہ تک نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ خدا کے متعلق ہونا چاہیئے تک کا یقین ہمارے اندر پیدا کر دے۔ گویا اگر غور کیا جاوے تو مجرد عقل ہمارے اندر خدا کے متعلق ایمان نہیں پیدا کر سکتی۔ مگر ہمیں ایمان کے لئے تیار کر سکتی ہے۔ ہمیں خدا دکھا نہیں سکتی۔ مگر خدا کی طرف دور سے اشارہ کر سکتی ہے۔ ہمیں خدا سے ملا نہیں سکتی۔ مگر خدا کی ملاقات کا دروازہ ہمارے لئے کھول سکتی ہے۔ ہمارے اندر اطمینان نہیں پیدا کر سکتی۔ لیکن اطمینان حاصل کرنیکے لئے جس بیقراری کی ضرورت ہے وہ ہمیں عطا کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں خدا کے متعلق یقین نہیں پیدا کر سکتی۔ لیکن یہ یقین ضرور پیدا کر سکتی ہے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے۔ اس کے آگے لیجانا مجرد عقل کا کام نہیں۔ کیونکہ اس مقام پر پہنچ کر عقل کے سامنے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (بصارت انسانی خدا کا ادراک نہیں کر سکتی) کا آہنی دروازہ روک ہو جاتا ہے جہاں فرشتوں کا پہرہ ہے اور جبتک عقل کے پاس خدائی دربار کا خاص پاسپورٹ نہ ہو وہ آگے نہیں گذر سکتی یا یوں سمجھو کہ عقل کی محدود نظر **ہونا چاہیئے** کے مقام تک پہنچ کر رک جاتی ہے اور پھر جبتک خدا

کیطرف سے اسے ایک خاص عینک نہ عطا کی جاوے۔ وہ آگے نہیں گذر سکتی لیکن جب اسے یہ خدائی
عینک ملجاتی ہے تو پھر ایسا ہوتا ہے کہ گویا تمام پردے جو رستہ میں روک ہوتے ہیں پھٹ جاتے ہیں
اور وہی نظر جو اس سے قبل درماندہ ہوکر واپس لوٹ جاتی تھی اب سیدھی خالق ہستی کے
منور چہرہ پر پڑنی شروع ہوتی ہے اور جُوں جُوں انسان قریب ہوتا جاتا ہے اس کا یہ منظر زیادہ
صاف ہوتا جاتا ہے اور علم اور عرفان ترقی کرتے جاتے ہیں۔ مگر اس قرب کی کوئی حد نہیں۔ اور نہ اس
علم و عرفان کی کوئی انتہا ہے کیونکہ خدا غیر محدود ہے اور غیر محدود کا عرفان بھی محدود نہیں ہوسکتا
اسی لئے رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (اے میرے رب میرے علم میں ترقی دے) جس طرح زید و بکر کے مُنہ سے
نکلتا ہے اسی طرح اس مقدس ہستی کے مُنہ سے بھی نکلتا تھا جسکی زبان پر خدا نے یہ جاری کیا کہ انا سید
ولد آدم ولا فخر (میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں) اور جسکے متعلق خدا نے فرمایا کہ دنی فتدلی
فکان قاب قوسین او ادنی (وہ ہم سے قریب ہوا۔ اور اتنا قریب ہوا کہ گویا ہم میں نہاں
ہوگیا) اللھم صل علی محمد و علی آل محمد و علی عبدك المسیح الموعود و بارك وسلم
مگر افسوس کہ اکثر لوگ جب ایمان کے ابتدائی مرتبہ کو حاصل کرتے ہیں تو یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ بس
ہم نے جو کچھ پانا تھا پالیا۔ اور اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ دنیا میں بیشتر حصہ ان لوگوں
کا ہے جو خدا تعالیٰ کے متعلق توجہ کرتے ہیں تو ہونا چاہیئے کے مرتبہ سے آگے نہیں گذرتے اور صرف
اسی مقام تک پُہنچ کر یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ہم نے خدا کو پالیا۔ حالانکہ گو اس میں شک نہیں ہے کہ
ہونا چاہیئے کا مرتبہ ہے کے مرتبہ کے لئے بطور ایک زینہ کے ہے اور عالم روحانیات میں انسان کو
ابتدائی بیداری اسی مقام میں پہنچ کر حاصل ہوتی ہے لیکن اگر اس مقام پر پہنچ کر انسان آگے قدم
بڑھانے سے رُک جاوے اور اسی کو اپنا منتہیٰ اور مقصود سمجھنے لگ جاوے۔ تو یہی حالت اس کے
واسطے نہایت خطرناک اور مہلک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اور بسا اوقات اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
انسان اپنے قدموں پر واپس لوٹ کر ہمیشہ کے لئے دہریت کے تاریک گڑھے میں گر جاتا ہے اور
خدا کو تلاش کرتا کرتا خدا کا منکر ہو بیٹھتا ہے۔ اور اسی انکار کی حالت میں اس پر موت آجاتی ہے
کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس قدر کوشش اور سعی کے وہ خدا کو نہیں پا سکا۔ اور زیادہ سے
زیادہ اس خیال تک پہنچ سکا ہے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے تو آخر آہستہ آہستہ مایوسی اس پر

غلبہ پانا شروع کرتی ہے اور بالآخر وہ اپنی عقل کی ہدایت کو ایک دھوکہ خیال کر کے خدا تعالیٰ کا منکر ہو جاتا ہے۔ اسکی ایسی ہی مثال سمجھنی چاہیئے جیسا کہ کوئی شخص کسی کمرے کے دروازے کو اندر سے بند پائے اور اس سے وہ یہ استدلال کرے کہ اس کمرے کے اندر ضرور کوئی شخص ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کا دروازہ خود بخود اندر سے بند نہیں ہوسکتا تھا لیکن وہ ایک بہت بڑا لمبا عرصہ اس دروازہ کے سامنے کھڑا رہے اور اسکو کھٹکھٹائے اور آوازیں دے لیکن وہ دروازہ اسکے لئے نہ کھولا جاوے اور نہ ہی اندر سے کوئی آواز اور آہٹ آوے تو آہستہ آہستہ اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے شروع ہونگے کہ ممکن ہے یونہی کسی نامعلوم بات کے نتیجہ میں یہ دروازہ اندر سے بند ہوگیا ہو۔ یا یہ کہ بند کرنیوالا اندر ہی مرچکا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور بالآخر ایک وقت اس پر ایسا آئے گا کہ وہ بالکل مایوس ہو جائیگا۔ اور اس یقین سے واپس لوٹ جائے گا۔ کہ کمرے کے اندر کوئی آدمی نہیں ہے۔ پس خدا کے متعلق بھی اگر ہونا چاہیئے والا ایمان ہے والے ایمان کیطرف رہنمائی نہیں کرتا۔ تو اس کا آخری نتیجہ بھی سوائے مایوسی اور دہریت کے اور کوئی نہیں۔ اور جو لوگ غور کا مادہ رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس مقام تک پہنچکر رک جاویں۔ وہ یا تو آگے قدم بڑھائیں گے اور یا مایوس ہوکر واپس لوٹ جائینگے لیکن افسوس کہ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں (اور انہی لوگوں کی کثرت ہے) کہ جنکی آنکھوں پر ایسا غفلت کا پردہ چھایا ہوتا ہے کہ وہ اس مقام تک پہنچ کر جو ہونا چاہیئے کا مقام ہے یہ تسلّی پا جاتے ہیں کہ ہم خدا تک پہنچ گئے ہیں اور جو کچھ ہم نے پانا تھا پالیا ہے۔ گویا اپنی نادانی اور غفلت اور جہالت سے وہ خدا تعالیٰ کے متعلق اس حد تک عرفان کافی سمجھتے ہیں کہ اس کارخانہ کا کوئی خالق ہونا چاہیئے اور ان کا ذہن پوری بیداری کے ساتھ اس طرف جاتا ہی نہیں کہ اگر کوئی خالق ہونا چاہیئے تو وہ ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کون ہے کہاں ہے کیا کیا صفات رکھتا ہے اسکے ساتھ ہم کس طرح تعلق پیدا کرسکتے ہیں۔ اور ہمیں کس طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کا بھی ہمارے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ایسے لوگ نہ تو آگے قدم بڑھانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی اس جھوٹی تسلی کی وجہ سے پیچھے لوٹتے ہیں اور انکی موت اسی حالت میں آتی ہے کہ وہ راستہ پر ہی بیٹھے ہوئے سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم منزل مقصود تک پہنچ چکے ہیں خدا کے ایمان کا دم بھرنے والے لوگ اکثر اسی قسم میں داخل ہیں۔ آہ بدقسمت انسان! تونے عقل کے

مدہم اور کمزور چراغ سے روشنی پاکر ایک حد تک راستہ طے کیا۔ اور پھر جب وہ وقت آیا کہ تو خدا کے روحانی سورج کی زبردست کرنوں کی روشنی میں داخل ہوکر خدا کیطرف اگر تا پڑتا نہیں بلکہ شوق سے دوڑتا بھاگتا ہوا قدم بڑھائے۔ اور ابتداءً دُور سے اپنے آقا و مولیٰ کو شناخت کرکے پھر اسکے قریب ہوتا چلا جاوے حتیٰ کہ اسکی مقدس صفات تجھے ماں کی گود کی طرح اپنے اندر ڈھانک لیں تو تُو یہ خیال کرکے کہ مَیں نے خدا کو پالیا۔ وہیں اپنی عقل کے مدہم چراغ کی کمزور روشنی میں راستہ سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا اور وہیں اپنی زندگی کے دن گذار دیئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تیرا دل جس کے اندر خالق فطرت نے یقین کی ایسی پیاس ودیعت کر رکھی ہے۔ جو بغیر حقیقی اطمینان کے تسلّی نہیں پاتی اور جس میں عشق و محبت کی وہ آگ بھڑکائی گئی ہے جو بغیر خدا کیطرف سے محبت کا چھینٹا پڑنے کے نہیں بجھتی۔ کس طرح بغیر اپنا مقصود حاصل کرنیکے تسکین پا سکتا ہے۔ تو اگر دھوکا نہیں دیتا تو یقیناً دھوکا خوردہ ہے اور یاد رکھ کہ بعض جگہ دھوکا کھانا بھی انسان کو مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے پس خدا سے ڈر اور راستہ میں بیٹھ رہ کر اپنی ہلاکت اور دوسروں کی گمراہی کا موجب نہ بن ÷

خدا کے متعلق عقلی دلائل

احتیاطی دلیل

اب میں مختصراً وہ عقلی دلائل بیان کرتا ہوں جنسے ہمیں خدا تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے اور جیساکہ اوپر بیان ہوا ہے یہ دلائل ہمیں صرف ہونا چاہیئے.. کے مقام تک لیجاتے ہیں اور اس سے اوپر جانے کے واسطے ہمیں اور قسم کے دلائل کی ضرورت ہوگی جو انشاء اللہ آگے چل کر بیان کئے جاویں گے۔ مگر ان عقلی دلائل کے بیان کرنے سے قبل مَیں ایک ایسی دلیل بیان کرنا چاہتا ہوں جو ایک احتیاطی دلیل ہے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ہم دنیا میں بعض اوقات ایک کام کو محض اس لئے بھی اختیار کرتے ہیں کہ اس کا اختیار کرنا گو ویسے کسی معقول بنا پر ضروری نہ ہو مگر احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھ کر ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم رات کے وقت کسی جنگل بیابان میں ڈیرہ لگاتے ہیں تو بعض اوقات باوجود اس علم کے کہ جنگل کے اس حصہ میں کسی درندہ یا چور چکار کا اندیشہ نہیں ہے ہم احتیاطاً رات کے وقت پہرہ کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اس خیال سے کہ گو بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ کوئی خطرہ کا احتمال پیدا ہو جاوے اور اسوقت ہم بے دست و پا

ہوں اور ہماری عقل ہمیں یہ مشورہ دیتی ہے کہ اگر تو کوئی خطرہ پیدا نہ ہو تو اس صورت میں پہرہ کا
انتظام ہمارے لئے نقصان دہ نہیں۔ اور اگر کوئی خطرہ پیدا ہو گیا تو لاریب پہرہ ہمیں بہت فائدہ
پہنچا سکتا ہے الغرض بسا اوقات ہم ایک کام کو محض احتیاطی پہلو سے اختیار کرتے ہیں اور ساری
دنیا اس بات پر متفق ہے کہ اس قسم کے احتیاطی انتظام بھی ضروری اور مفید ہوتے ہیں۔ اب اس
اصول کے ماتحت ہم ہستی باریتعالیٰ کے اصول پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہماری عقل یہی فیصلہ کرتی ہے کہ خدا
تعالیٰ پر ایمان لے آنا انکار کر دینے سے زیادہ اقرب بالامن ہے۔ اگر تو کوئی خدا نہیں اور یہ سارا
کارخانۂ عالم محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارا خدا پر ایمان لانا ہمارے واسطے کسی طرح
نقصان دہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی خدا ہے تو ہمارا یہ ایمان بے ریب سراسر مفید اور فائدہ مند ہے
آخر اس سوال کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں تیسرا تو کوئی ممکن نہیں یا یہ ساری دنیا خود بخود اپنے
آپ سے ہے۔ اور خود بخود ہی چلتی ہے اور خدا (نعوذ باللہ) ایک خیال باطل ہے اور یا اس کا
ایک خالق و مالک ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اسے چلا تا جا رہا ہے۔ انکے علاوہ تیسرا کوئی
پہلو ہماری عقل تجویز نہیں کرتی۔ اب اگر ہم خدا کا انکار کر دیتے ہیں تو یہ امکان کہ ممکن ہے کہ کوئی خدا
ہو ہمارے واسطے خطرناک احتمالات پیش کرتا ہے۔ اور اگر ہم خدا پر ایمان لے آتے ہیں تو یہ
امکان کہ ممکن ہے کوئی خدا نہ ہو ہمارے واسطے قطعاً کوئی خطرناک احتمال پیش نہیں کرتا۔ فایّ
الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون۔ کون گروہ امن کے زیادہ قریب ہے انکار
کر دینے والا یا ایمان لانے والا؟ پس ثابت ہوا کہ خدا کو مان لینا ہی احتیاط کا رستہ ہے۔ کیونکہ اس
میں کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں ہے۔ اور انکار کر دینے میں سراسر نقصان کا احتمال ہے وھو المراد
کہتے ہیں کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا تھا کہ خدا کی ہستی کا کیا ثبوت ہے انہوں نے یہ دیکھ کر کہ سائل
ایک سیدھا سادھا آدمی ہے اسے یہی جواب دیا کہ دیکھو تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر تو کوئی خدا
نہیں ہے تو مان لینے والے اور نہ ماننے والے سب برابر ہیں۔ کسی کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اور اگر
خدا ہے تو خوب یاد رکھو کہ انکار کرنیوالے کی خیر نہیں۔ اس شخص کو اسی دلیل سے تسلی ہو گئی اور اُس نے
آگے کوئی سوال نہ کیا۔ واقعی اگر تو کوئی خدا نہیں ہے تو ہمیں مان لینے میں حرج کیا ہے؟ وہ کونسی
چیز ہے جو خدا کو مان کر ہمیں چھوڑنی پڑتی ہے؟ موٹی باتوں میں زنا۔ قتل۔ چوری۔ ڈاکہ۔ جھوٹ

دھوکا۔ فریب وغیرہ ہی وہ باتیں ہیں جو ایمان باللہ تم سے چھڑاتا ہے۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جنکو خود تمہاری فطرت اور تمہاری عقل اور تمہاری حکومت بھی تم سے چھڑا رہی ہیں۔ پس خدا پر ایمان لے آنے سے تمہارا نقصان کیا ہوا؟ یہ ایمان تمہاری کسی جائز خواہش کے جائز طور پر پورا ہوتے میں قطعاً کوئی روک نہیں ہوتا۔ تم جائز طور پر کھاؤ پیو۔ سوؤ جاگو۔ اٹھو بیٹھو۔ کھیلو کودو۔ پڑھو لکھو۔ دنیا کے کام کرو۔ دوستیاں لگاؤ۔ بیویاں کر کے اولاد پیدا کرو۔ تمہارا خدا پر ایمان لانا ہرگز تمہیں کسی ایسے کام سے نہیں روکتا بلکہ وہ صرف ایسے کاموں سے منع کرتا ہے جو تمہاری ذات کے لئے یا دوسروں کی ذات کے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ ہیں۔ اور ایسے کاموں سے باز رہنا خود تمہاری فطرت اور عقل اور قانونِ تمدن کا بھی تقاضا ہے۔ پس تمہیں خدا پر ایمان لے آنے میں نقصان کیا ہے؟ اور اگر کہو کہ ہم کیوں بلا ثبوت خدا کو مانیں تو میں کہتا ہوں کہ جس طرح تم دنیا میں بے شمار احتیاطی تجاویز کیا کرتے ہو اسی طرح کی ایک تجویز اسے بھی سمجھ لو۔ بہرحال جب مان لینے میں فائدہ کا احتمال ہے اور نقصان کا کوئی احتمال نہیں اور انکار کر دینے میں فائدہ کا کوئی احتمال نہیں اور نقصان کا احتمال ہے تو پھر خود سوچ لو کہ کونسا طریق امن اور احتیاط کے زیادہ قریب ہے۔ ظاہر ہے کہ عموماً خدا کا انکار کرنے والے صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ انکے نزدیک خدا کی ہستی کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اس لئے نہیں کرتے کہ خدا کے نہ ہونے کا انکے پاس کوئی ثبوت ہے۔ پس اس صورت میں احتیاطی پہلو کو مدنظر رکھ کر ہر عقلمند کی عقل یہی فتویٰ دیگی۔ کہ خدا پر ایمان لانا ہی اقرب بالامن ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اگر تو خدا کوئی نہیں تو سب برابر ہوئے۔ ہمیں کوئی خاص نقصان نہیں۔ اور اگر خدا ہے تو ماننے والے فائدہ میں رہے اور انکار کرنیوالے اپنا انجام آپ سوچ لیں۔ اور اگر کوئی شخص یہ شبہ پیدا کرے کہ ایسا ایمان کس کام کا ہوگا جسکی بنا محض احتیاطی پہلو پر ہوگی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک ایسا ایمان حقیقی ایمان نہیں کہلا سکتا لیکن نہ ہونیسے ضرور بہتر ہے اور کم از کم ایسا شخص اس ایمان کی وجہ سے خدا کیطرف متوجہ رہے گا۔ اور یہ توجہ اسے حقیقی ایمان کے حصول میں بطور زینہ کے کام دے سکے گی۔ علاوہ ازیں یہ ایمان گاہے گاہے نیک اعمال بجا لانیکے لئے بھی محرک ہو سکتا ہے۔ بہرحال خواہ ایمان کیسا ہی ناقص ہو نہ ہونیسے بہرحال وہ بہتر ہے اور ایسا ایمان اس احتیاطی دلیل کے نتیجہ میں بھی پیدا ہو سکتا ہے وھو المراد

فطری دلیل

اس کے بعد میں اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلی دلیل جو ہستی باری تعالیٰ کے متعلق میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ فطری دلیل ہے۔ خدا تعالیٰ کے متعلق تحقیق کی ضرورت کے مضمون پر بحث کرتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ ہماری فطرت خود اس سوال کو ہمارے اندر پیدا کر رہی ہے کہ آیا کائناتِ عالم کا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں۔ اس لئے ہم اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ فطرتِ انسانی یہ سوال پیدا کر کے خاموش نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کا جواب بھی دیتی ہے اور وہ لوگ جو فطرت کی آواز سننے کے عادی ہیں۔ اس آواز کو بھی سنتے اور سن سکتے ہیں۔ فطرت سے مراد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ فطرت کہتے کسے ہیں اُس وقت تک فطرت کی آواز کے معنی سمجھنے بھی مشکل ہیں۔ سو جاننا چاہیئے کہ فطرت ایک عربی لفظ ہے جو فطر سے نکلا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔ فلانٌ فطرَ الامرَ اے اخترعہ و ابتدءہ و انشأہ یعنی جب یہ کہا جاوے کہ فلاں شخص نے فلاں امر فطر کیا تو اس سے مُراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے فلاں امر کو جو پہلے موجود نہ تھا بنایا اور اسکی ابتدا کی۔ اور اسے نیست سے ہست میں لا کر بلند ہونے کے قابل بنا دیا۔ چنانچہ اسی بنا پر لغت والوں نے فطرت کے معنی یہ لکھے ہیں الصفۃ التی یتّصف بھا کل موجودٍ فی اوّل زمان خلقتہ یعنی فطرت ان صفات کا نام ہے جو ہر ایک چیز میں اسکی ابتداء خلقت کے وقت ودیعت کی جاتی ہیں۔ اس تعریف کے مطابق فطرتِ انسانی سے وہ صفات و خواص مُراد ہونگے جو بیرونی اثرات کے نتیجہ میں نہیں پیدا ہوئے بلکہ خلقی اور طبعی طور پر انسان کے اندر مرکوز کئے گئے ہیں تاکہ وہ انکے ذریعہ اپنے واسطے ترقیات کا دروازہ کھول سکے۔ ظاہر ہے کہ ہر چیز کچھ خواص اپنے اندر رکھتی ہے جو اسکے خواص طبعی کہلاتے ہیں۔ ان خواص کا مجموعہ فطرت ہے۔ یہ خواص اور صفات بیرونی اثرات کے ماتحت آکر یا تو دب جاتے ہیں یا چمک جاتے ہیں اور اسی پر کسی ہستی کی ترقی اور تنزل کا دارومدار ہے اور ہر شخص اپنے اندر غور کرکے اس بات کا پتہ لگا سکتا ہے کہ اسکے فطری خواص کس راستہ پر چل رہے ہیں۔ مثلاً راست گفتاری انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہے یعنی انسان کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ وہی بات مُنہ پر لائے جو واقعہ کے مطابق ہے۔ اور ہر بچہ ابتداءً اسی فطری خاصہ کے مطابق اپنا رویہ رکھتا ہے لیکن بعض اوقات جب وہ دیکھتا ہے کہ اسکے کسی کام پر اسکے والدین ناراض ہوتے ہیں اور وہ کام

کسی وجہ سے اسے پسند خاطر ہوتا ہے۔ تو وہ اس کام کو کرتا ہے لیکن اپنے والدین کی ناراضگی سے ڈر کر ان سے اپنے اس کام کو چھپانا چاہتا ہے اور یہ پہلا پردہ ہوتا ہے جو اسکی فطرت پر پڑتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اس بات کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے کہ کام تو وہی کرتا ہے جو اسے پسند ہوتا ہے لیکن والدین سے نہ صرف اسے چھپاتا ہے بلکہ انکے دریافت کرنے پر خلاف واقعہ بیان دے دیتا ہے اور اس طرح اس کا یہ فطری جذبہ کہ ہر معاملہ میں سچ سچ بات کہدینی چاہیئے ظلمت کے پردوں کے نیچے دبتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ وقت آتا ہے کہ جب وہ اپنی فطرت کو بالکل ہی بھول جاتا ہے اور ایسے ہی موقعہ پر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی فطرت مرچکی ہے۔ حالانکہ دراصل فطرت کبھی نہیں مرتی بلکہ صرف بیرونی اثرات کے نیچے دب کر مستور و محجوب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے فطری جذبات کا حال ہے مثلاً محبت۔ نفرت۔ حلم۔ غضب۔ عفو۔ انتقام۔ شجاعت۔ خوف۔ عفت۔ شہوت۔ ترقی کی خواہش تنزل سے نفرت وغیرہ وغیرہ۔ سب فطرت انسانی کے اندر طبعی طور پر مرکوز ہیں۔ لیکن بیرونی اثرات ان کو دباتے یا چمکاتے رہتے ہیں یعنی کبھی تو یہ خواص افراط کیطرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی تفریط کیطرف۔ اور کبھی حد اعتدال کے اندر اندر رہتے ہیں۔ ان حالات میں فطرت کی آواز کا سوال ایک نازک اور مشکل سوال ہے اور سوائے اس شخص کے جسکے فطری جذبات اعتدال کی حالت میں ہوں۔ دوسرے لوگ خود اپنی فطرت کے متعلق بھی بعض اوقات بلکہ عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن باینہمہ اس میں شک نہیں۔ کہ فطرت ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا اور ہر فطری خاصہ کا ایک تقاضا ہوتا ہے جو اسکی آواز کہلاتا ہے۔ مثلاً راست گفتاری ایک فطری خاصہ ہے اور اس خاصہ کا یہ تقاضا ہے کہ جب کوئی موقعہ پیش آئے تو جو واقعہ ہے اس کے مطابق انسان اپنا بیان دے نہ کوئی بات چھپائے اور نہ کوئی زیادہ کرے اور یہی تقاضا فطرت کی آواز کہلائیگا چنانچہ اس فطری آواز کو زندہ رکھنے کے واسطے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی اے انسان تو اپنے طریق میں اپنے آپ کو اعتدال کی حالت میں رکھ۔ تاکہ تو اس فطرت پر قائم رہ سکے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے" اب ہر شخص اپنے اندر غور کرے کہ کیا اسکی فطرت ہستی باریتعالیٰ کے متعلق کوئی آواز پیدا کر رہی ہے یا نہیں۔ کیا وہ جب الگ اپنے دل سے

یہ سوال کرتا ہے کہ کیا میں یونہی خود بخود اتفاق کا نتیجہ ہوں یا مجھے کسی بالاہستی نے پیدا کیا ہے تو اسے اس سوال کے جواب میں بجبر اسکے کہ وہ عقلی دلائل کی رو سے کوئی رائے قایم کرے کوئی آواز سنائی دیتی ہے یا نہیں؟ قرآن شریف فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (اعراف ع ۱۲) یعنی "اللہ تعالیٰ نے جب بنی نوع انسان کی نسل کو چلایا تو خود ان سے ان کے نفسوں پر شہادت لی اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں بیشک تو ہمارا رب ہے اور یہ ہم نے اس لئے کیا کہ تا قیامت کے دن تمہیں یہ عذر نہ رہے۔ کہ ہمیں تو خدا کے متعلق کچھ پتہ ہی نہیں لگا" اس آیت کریمہ سے یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو جس طرح دوسرے خواص وصفات اسکے اندر ودیعت کئے۔ اسی طرح یہ بات بھی اسکی فطرت میں رکھ دی کہ تیرا ایک خالق ومالک ہے جس سے تجھے غافل نہ رہنا چاہیئے تا کہ قیامت کے دن کسی کو یہ عذر نہ رہے کہ ہم تو لاعلمی کی حالت میں ہی رہے ورنہ ہم ضرور خدا کیطرف توجہ کرتے۔ غرض دوسرے فطری خواص کیطرح یہ بھی ایک فطری خاصہ ہے کہ ہم خود بخود نہیں ہیں بلکہ ایک بالاہستی کی قدرتِ خلق سے عالم وجود میں آئے ہیں۔ اور ہر شخص جسکی فطرت بیرونی اثرات کے نیچے مستور ومحجوب نہیں ہوچکی۔ اپنے اندر ضرور اس آواز کو گاہے گاہے اٹھتا ہوا پائے گا کہ میرا ایک پیدا کرنے والا ہے بلکہ جو لوگ کسی وجہ سے اپنی فطرت کو ظلمت اور غفلتوں کے پردہ کے نیچے دفن کرچکے ہیں۔ انپر بھی بعض ایسے حالات آجاتے ہیں کہ انکی فطرت سوتی سوتی اچانک جاگ کر انکے کان میں یہ آواز پیدا کردیتی ہے چنانچہ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک دہریہ بھی سخت اور اچانک مصیبت کے وقت رام رام یا اللہ اللہ پکارنے لگ جاتا ہے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عادت کا نتیجہ ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ عادت تو حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتی ہے ایک شخص جو خدا کا منکر ہے اور سالہا سال سے انکار پر قائم چلا آتا ہے بلکہ خدا پر ایمان لانیوالوں کے خلاف تقریر وتحریر کے ذریعہ زہر اگلتا رہتا ہے اسکے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا خدا کو پکارنا کسی عادت کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اسکی عادت تو خدا کو برا بھلا کہنا اور گالیاں دینا ہے نہ کہ خدا کو

مدد کے واسطے پکارنا۔ پس ایک سالہا سال کے پختہ دہریہ کے مُنہ سے اچانک مصیبت کے وقت رام رام یا اللہ اللہ کا لفظ نکلنا فطرت کی آواز کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ مصیبت بھی ایک زلزلہ کا رنگ رکھتی ہے اور جس طرح زلزلہ بعض اوقات دبی ہوئی چیزوں کو باہر نکال پھینکتا ہے اسی طرح مصائب کا اچانک زلزلہ بھی بعض اوقات انسان کی دبی ہوئی فطرت کو اسکے مدفن سے باہر نکالکر ننگا کر دیتا ہے اور پھر وہی فطرت کی آواز جو ہزاروں پردوں کے نیچے دبی ہوئی ہونیکی وجہ سے سُنائی نہ دیتی تھی۔ اب موقعہ پاکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسکی فطرت کی آواز بہ زیادہ وضاحت کے ساتھ اسکے کانوں میں سُنائی دینے لگتی ہیں۔ اسکی بھی یہی وجہ ہے کہ جوانی میں عموماً ہزاروں قسم کی غفلتیں انسان کو گھیرے رکھتی ہیں اور دنیاوی کاروبار کی بھی کثرت ہوتی ہے۔ اور جذبات بھی اپنے جوش میں ہونے کی وجہ سے عموماً حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن جب انسان بوڑھا ہونے لگتا ہے تو یہ جوش و خروش ٹھنڈا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یہ غفلتیں دُور ہونی شروع ہوتی ہیں اور دُنیاوی کاروبار سے بھی قدرے فرصت ملتی ہے تو اس صورت میں فطرت کو پھر موقعہ ملجاتا ہے کہ اپنی آواز انسانوں کے کانوں تک پہنچا سکے۔ دیکھ لو۔ دہریوں میں اکثر جوان نظر آئیں گے اور عموماً جب انکی جوانی ڈھلنے لگے گی۔ تو اسکے ساتھ ہی ان کے خیالات میں ایک تغیر پیدا ہونا شروع ہو جائیگا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑھاپے کی حالت میں پہنچکے بہت سے دہریہ خدا کے قائل ہو جاتے ہیں کیونکہ اب انکی فطری آواز ان تک پہنچتی رہتی ہے اور انکو مجبور کرتی ہے کہ وہ انکار سے باز آجائیں۔ مستثنیات کا سوال الگ ہے ورنہ عام قاعدہ یہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ہاں اگر کسی شخص کو بڑھاپے میں بھی ایسے حالات درپیش رہیں کہ جو اس کی فطرت کو دبائے رکھیں تو وہ بیشک دہریت کی حالت پر ہی قایم رہے گا۔ لیکن چونکہ عموماً اس قسم کے غافل کن حالات جوانی میں ہی پیش آتے ہیں۔ اس لئے دہریت کا شکار بھی اکثر جوان ہی ہوتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تبدیلی فطرت کی آواز کی وجہ سے نہیں بلکہ موت کے ڈر کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی جب ایک بوڑھا شخص دیکھتا ہے کہ اب میری موت قریب ہے تو طبعاً وہ خائف ہونا شروع ہوتا ہے اور اس خوف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کیطرف مائل ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دلیل تو ہمارے حق میں ہے نہ کہ ہمارے خلاف۔ موت کا خوف بھی تو ایک فطری آواز ہے ورنہ ایک دہریہ کیا

اور موت کا خوف کیا۔ جو شخص اپنی زندگی کو محض اتفاق کا نتیجہ قرار دیتا ہے اسکی نظر میں موت سوائے اسکے اور کوئی حقیقت نہیں رکھ سکتی۔ کہ وہ زندگی جو اتفاق کا نتیجہ تھی اب اتفاق کے نتیجہ میں ہی یا کسی اور وجہ سے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہو رہا ہے اور بس۔ پس موت کا قرب ایک دہریہ کے قلب پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ لہذا ثابت ہوا کہ خود موت کا خوف بھی کسی اندرونی تغیر کا نتیجہ ہے اور اسی کا نام ہم فطرت کی آواز رکھتے ہیں۔ بات وہی ہے کہ جب غفلت اور ظلمت کے پردے اُٹھنے شروع ہوتے ہیں۔ تو ہماری فطرت پھر ہمارے دل پر حکومت کرنیکا موقعہ پا لیتی ہے اور ہم ایک غیر محسوس طاقت سے ایمان باللہ کیطرف کھچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ؎

آنکھ کے اندھوں کو حائل ہو گئے سو سو حجاب ☐ ورنہ قبلہ تھا ترا رُخ کافر و دیندار کا

پس فطرت انسانی ہستی باریتعالیٰ کا ایک زبردست ثبوت ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا سراسر احسان ہے کہ اس نے ہماری ہدایت کے لئے ہماری فطرت کے اندر ہی ایمان کا بیج بو رکھا ہے چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذّریات ع۱) یعنی "اے لوگو تمہیں اِدھر اُدھر جانیکی ضرورت نہیں۔ تمہارے تو خود اپنے نفسوں میں آیات موجود ہیں مگر تم دیکھو بھی" کسی شاعر نے کہا ہے:۔ ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار ☐ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اس شاعر نے تو نہ معلوم کس خیال سے یہ شعر کہا ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا نے اپنی تصویر ہر انسان کے دل میں منقوش کر رکھی ہے مگر متکبر انسان اپنی گردن تک جھکانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ خدا نے ہر انسان کی فطرت کے اندر اپنے عشق کی چنگاری مرکوز کی ہے مگر کم ہیں جو اس آگ کو بجھنے سے بچاتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں: ؎

تُو نے خود رُوحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک ☐ جس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا

ایک دم بھی کل نہیں پڑتی مجھے تیرے سوا ☐ جاں گھٹی جاتی ہے جیسے دِل گھٹے بیمار کا

شور کیسا ہے ترے کوچے میں لے جلدی خبر ☐ خوں نہ ہو جائے کسی دیوانہ مجنوں وار کا

کائنات خلق اور نظام عالم کی دلیل

اس کے بعد میں اس دلیل کو لیتا ہوں جو عقلی دلائل میں سے سب سے زیادہ معروف ہے بلکہ دراصل یہی ایک دلیل ہے جس پر دنیا کے بیشتر حصہ کے ایمان کا دارومدار ہے اور ویسے بھی غور کیا جاوے تو درحقیقت جہاں تک انسان کی مجرد عقل کی پہنچ ہے اس سے زیادہ روشن اور سریع الاثر دلیل خیال میں نہیں آسکتی۔ یاد رہے کہ یہاں ان دلائل و براہین کا ذکر نہیں جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں اور جن سے خدا تعالیٰ کا وجود حق الیقین کے طور پر ثابت ہو جاتا ہے اور جن کے ذریعہ سے انسان خدا کیطرف محض اشارہ ہی نہیں پاتا بلکہ واقعی خدا کو دیکھ لیتا اور پا لیتا ہے بلکہ یہاں صرف عقلی دلائل کا ذکر ہے جنکی پہنچ ہونا چاہیئے والے ایمان سے آگے نہیں۔ اور ان دلائل میں سے واقعی وہ دلیل جو میں اب بیان کرنا چاہتا ہوں ایک نہایت ہی روشن دلیل ہے اور یہ زیادہ تر اسی دلیل کی برکت ہے کہ باوجود اسکے کہ اس زمانہ میں دُنیا خدا تعالیٰ کے عرفان سے گویا کلیتہً تاریکی میں ہے۔ وہ باری تعالیٰ کے وجود سے بالکل منکر ہو جانیسے سے بھی بچی ہوئی ہے اور اسے اس معاملہ میں انکار کیطرف قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ ابتدائی دلیل ہے جو ہمیشہ الٰہی کتب میں بھی غافل انسانوں کو بیدار کرنیکے لئے استعمال ہوتی رہی ہے اور قرآن شریف نے بھی اسے کثرت کے ساتھ بار بار استعمال کیا ہے۔ یہ دلیل مسبب سے سبب کیطرف جانیکی دلیل ہے۔ اور اگر علمی طور پر دیکھا جاوے تو یہ دلیل دراصل دو دلیلوں کا مجموعہ ہے۔ ایک دلیل تو وہ عام معروف دلیل ہے جس میں مخلوق کے وجود سے خالق کے وجود پر استدلال کیا جاتا ہے اور یہ دلیل سادہ ہونیکی وجہ سے عامۃ الناس کو زیادہ اپیل کرتی ہے۔ دوسری دلیل وہ ہے جس میں اس عالم دنیوی کے حالات اور نظام عالم کا مطالعہ کر کے اس عالم کی پیدا کرنیوالی اور اس نظام کی جاری کرنے اور قائم رکھنے والی ہستی کے وجود پر دلیل پکڑی جاتی ہے اور یہ دلیل آگے خود کئی حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے مگر اس جگہ اختصار و سہولت کی غرض سے ان دو دلیلوں کو ایک ہی مخلوط دلیل کی صورت میں بیان کیا جاوے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔ پہلا حصہ دلیل کا جو مخلوق کے وجود سے خالق کے وجود کیطرف جانے سے تعلق رکھتا ہے اپنی ظاہری صورت میں بہت سادہ ہے۔ مثلاً میں دیکھتا ہوں کہ اسوقت میرے سامنے میز پر بہت سی چیزیں رکھی ہیں اور ہر چیز اپنی ہستی سے مجھے ایک سبق دے رہی ہے۔ میرے سامنے کاغذ

ہے - میرے ہاتھ میں قلم ہے - اس قلم میں روشنائی ہے روشنائی کو خشک کرنے کے لئے میرے کاغذ کے نیچے جاذب ہے اور کاغذوں کو اِدھر اُدھر اُڑانے سے بچانے کے لئے ان پر شیشہ کا ایک خوبصورت ٹکڑا رکھا ہے جسے پیپر ویٹ کہتے ہیں - میرے بیٹھنے کے لئے میرے نیچے کرسی ہے اور سہارا لینے کے لئے میرے سامنے میز ہے - میز کو صاف رکھنے اور خوشنما بنانیکے لئے میز پر ایک میز پوش ہے اور میز پر ایک طرف کچھ کتابیں رکھی ہیں جنہیں میں بوقت ضرورت دیکھتا رہتا ہوں - یہ سب چیزیں اس وقت میرے سامنے ہیں اور محض اپنے موجود ہونیسے میرے اندر یہ یقین پیدا کر رہی ہیں کہ ہمیں کسی بنانے والے نے بنایا ہے - پھر میں کسی کمرے کے اندر ہوں اس کمرے کی چاروں طرف چار دیواریں ہیں انکے اوپر چھت ہے کمرے میں کچھ کھڑکیاں اور دروازے ہیں جنپر پردے لٹک رہے ہیں - کمرے کے فرش پر دری ہے اور دری پر ادھر اُدھر کچھ سامان رکھا ہے - میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں اور میرا دل اس یقین سے بھرا ہوا ہے کہ یہ چیزیں خود بخود نہیں بلکہ کسی کاریگر کی محنت کا ثمرہ ہیں - اگر کوئی شخص میرے پاس آئے اور مجھ سے یہ منوانا چاہے کہ یہ جو ساری چیزیں تجھے نظر آرہی ہیں - انکو کسی نے نہیں بنایا بلکہ یہ خود بخود ہی اپنی موجودہ شکل میں ظاہر ہو گئی ہیں تو میں اسکی اس بات کو کبھی نہیں مانونگا - مگر افسوس کہ اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جو ہم سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ یہ زمین یہ آسمان یہ حیوانات یہ نباتات یہ جمادات یہ اجرام سماوی کسی صانع کی صنعت کا ثمرہ نہیں بلکہ خود بخود ہمیشہ سے چلے آئے ہیں بھلا انکی اس بات کو کس طرح مان لوں - میرے سامنے اس وقت عرب کے ایک بدوی کا قول ہے جس سے کسی نے پوچھا تھا کہ تیرے پاس خدا کی کیا دلیل ہے اس نے جواب دیا - البعرۃ تدل علی البعیر واثر القدم علی المسیر فالسماء ذات البروج والارض ذات فجاج اما تدل علی قدیر - یعنی جب کوئی شخص جنگل میں سے گذرتا ہوا ایک اونٹ کی مینگنی دیکھتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس جگہ سے کسی اونٹ کا گذر ہوا ہے - اور جب وہ صحرا کی ریت پر کسی آدمی کے پاؤں کا نشان پاتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ یہاں سے کوئی آدمی گذرا ہے - تو کیا تمہیں یہ زمین معہ اپنی وسعت کے اور یہ آسمان معہ اپنے سورج اور چاند اور ستاروں کے دیکھ کر اس طرف خیال نہیں جاتا کہ ان کا بھی کوئی بنانے والا ہوگا؟ اللہ اللہ کیا ہی سچا کیا ہی تصنع سے خالی - مگر دانائی سے پُر یہ کلام ہے جو اس ریگستان کے فرزند

کے مُنہ سے نکلا مگر جسکی گہرائی تک فلسفی باوجود اپنی حکمت و فلسفہ کے نہ پہنچ سکا! قرآن شریف خلق و
نظامِ عالم کے متعلق فرماتا ہے:۔ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ
فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى
السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا
وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى
لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا
وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۔ وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِیْ
بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ وَاَوْحٰى رَبُّكَ
اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِیْ
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ
اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ فَلْيَنْظُرِ
الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا
فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّ
فَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرُنِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ
اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا
مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ وَ
اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ یعنی "کیا تم خدا کی ہستی
کے متعلق شک کرتے ہو وہ خدا جو زمین و آسمان کو نیست سے ہست میں لانے والا ہے۔ تحقیق

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان جہازوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں اٹھائے ہوئے سمندر کے اندر چلتے پھرتے ہیں۔ اور اس پانی میں جو خدا اوپر سے اُتارتا ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ مُردہ زمین کو زندہ کرتا اور جاندار چیزوں کو زمین میں پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے چلنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں۔ خدا کیطرف سے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں۔ اور خود تمہارے اپنے نفسوں میں بھی نشانیاں ہیں مگر تم دیکھو بھی۔ کیا لوگ اس آسمان کیطرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے جو ان کے سروں کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور پھر کس طرح اسے مختلف اجرام سے مزین کیا ہے اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے اور پھر ہم نے کس طرح زمین کو (باوجود اسکے گول ہونیکے) پھیلا رکھا ہے اور اس میں پہاڑ کھڑے کئے ہیں اور اس میں ہر قسم کی بارونق چیزوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ یہ نظارہ اس لئے ہے کہ تاکہ توجہ کرنیوالے بندوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنے بھولے ہوئے خدا کو پھر یاد میں لے آئیں۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ ہر چیز خواہ وہ آسمان میں ہے یا زمین میں ہے۔ اللہ تعالےٰ کے سامنے اطاعت کا سجدہ بجا لا رہی ہے اور اس قانون سے باہر نہیں جا سکتی۔ جو خدا نے اسکے واسطے مقرر کر رکھا ہے اور ہر چیز اپنے اپنے دائرہ میں الگ الگ چل رہی ہے اور دوسری چیزوں سے ٹکراتی نہیں۔ اور پھر دودھ دینے والے چوپایوں پر نگاہ ڈالو کیونکہ ان میں بھی تمہارے لئے ایک سبق ہے۔ دیکھو ہم کس طرح انکے پیٹوں کے گوبر اور خون میں سے خالص دودھ تمہارے لئے الگ کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے لذت اور نفع کا موجب ہوتا ہے۔ اور ہاں ذرا شہد کی مکھی کیطرف بھی دیکھنا۔ تمہارے رب نے اسے یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور بیلوں کے اوپر اپنا مکان بنائے اور پھر پھلوں کا رس چوسے اور مطیع ہو کر تمہارے رب کے راستوں پر چلے تاکہ اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا شہد بر آمد ہو۔ اس میں لوگوں کے واسطے شفا رکھی گئی ہے تحقیق غور کرنیوالوں کے لئے اس میں بھی ایک نشان ہے۔ پھر اے انسان اپنے روزمرہ کے کھانے کیطرف نگاہ کر اور دیکھ کہ ہم کس طرح تیری خاطر ایک قاعدہ کے ماتحت پانی کو اوپر سے گراتے ہیں اور پھر ایک ضابطہ سے سطح زمین کو پھاڑتے ہیں اور پھر اس میں سے غلہ اُگاتے ہیں اور انگور اور سبزی ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور میووں سے لدے ہوئے باغات اور پھل اور چارہ پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے واسطے سامان زندگی کا کام

دے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں یہ ساری حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ وہی تو ہے جس نے موت اور زندگی کا سلسلہ جاری کیا۔ تاکہ یہ دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال بجالاتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا خدا ہے جس نے تمہارے اوپر سات بلندیوں کو ترتیب کے ساتھ پیدا کیا اے انسان کیا تو رحمٰن کی مخلوقات میں کوئی نقص پاتا ہے؟ اپنی نظر کو چاروں طرف خوب دوڑا اور پھر بتا کہ کیا تجھے کوئی فطور نظر آتا ہے؟ اور پھر دوبارہ سہ بارہ نظر کو چکر دے۔ مگر یاد رکھ۔ تیری نظر تیری طرف ذلیل و ماندہ ہو کر لوٹے گی۔ اور خدا کی خلق میں کوئی رخنہ نہ دریافت کر سکے گی۔ کیا یہ سادہ باتیں تجھے خدا کیطرف راستہ نہیں دکھاتیں۔ ہلاک ہو گیا انسان۔ وہ کیسا ناشکر گذار ہے۔"

یہ آیات قرآنی جو قرآن شریف کے مختلف حصوں سے لی گئی ہیں جس فصاحت و بلاغت کے ساتھ کائنات خلق اور نظام عالم کی طرف توجہ دلا کر ہستی باریتعالےٰ کا نشان دے رہی ہیں وہ محتاج تفسیر نہیں۔ واقعی ایک غور کرنیوالی طبیعت کے لئے دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کیطرف اشارہ کر رہی ہے اور انسان جسقدر بھی نظام عالم اور خواص اشیاء کے مطالعہ میں ترقی کرتا ہے اس کے لئے یہ اشارہ زیادہ واضح اور معین صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ دنیا کی ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز کو لے لو اور پھر اس پر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ حقیر چیز ایک ایسے عظیم الشان اور حکیمانہ قانون کے ماتحت کام کر رہی ہے۔ اور اس میں ایک ایسی ترتیب اور علت غائی نظر آتی ہے کہ عقل حیران ہو جاتی ہے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی انسانی دماغ کے لئے ایک لاینحل عقدہ پیش کرتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔ ؎

بنا سکتا نہیں اک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز | تو پھر کیونکر بنانا نور حق کا اسپہ آساں ہے

ایک مکھی کو ہی دیکھو یہ حقیر اور ذلیل جانور بھی کس درجہ تک خدا کی عظیم الشان قدرت نمائیوں کا کرشمہ ہے۔ اگر انسان ساری عمر صرف ایک مکھی اور اسکے اعضاء وغیرہ کے متعلق تحقیق کرنے میں صرف کر دے تو یقیناً وہ دیکھیگا کہ اسکی زندگی تو ختم ہو جاوے گی۔ لیکن تحقیق کا میدان ابھی اسکی آنکھوں کے سامنے غیر دریافت شدہ حالت میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔ خود انسانی بدن کو دیکھ لو جیسے کہ دنیا بنی ہے دنیا کے بہترین دماغ ہر زمانہ میں لاکھوں کی تعداد میں اسکی بناوٹ کے متعلق تحقیق کرتے چلے آئے ہیں اور اس قانون کے معلوم کرنیکے پیچھے پڑے رہے ہیں جو مختلف اعضاء

انسانی میں کام کر رہا ہے۔ لیکن خدا کی اس چھوٹی سی کان کا کتنا حصہ ہے تو وہ اس وقت تک دنیا کے سامنے نکال کر پیش کر سکے ہیں؟ اور یقیناً دنیا کا خاتمہ آجائے گا۔ لیکن اس کان کے خزانے ختم ہو نگے ایک پھول کو لے لو جو تمہارے راستہ کے ایک کنارے پر خود رو طور پر نکل آتا ہے اور بسا اوقات کسی بے درد غافل راہگیر کے پاؤں کے نیچے مسلا جا کر ہمیشہ کے لئے دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اسکی ننھی ننھی پتیوں میں ہزار ہا رگیں اور نالیاں ایک جال کیطرح پھیلی ہوئی ہیں اور یہ ہر رگ اور ہر نالی اپنے کام اور اپنے قانون کے لحاظ سے ایک عالم کا حکم رکھتی ہے جسکی کامل دریافت کے واسطے عمر نوح بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ ہاں ذرا اس حقیر اور قریباً نہ نظر آنے والے تخم پر بھی ایک نظر ڈالو جو ایک مٹھی بھر جگہ میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سما سکتا ہے لیکن جب وہ زمین میں ڈالا جاتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان درخت بنجاتا ہے جسکے سایہ کے نیچے ہزاروں انسان آرام کر سکتے ہیں۔ اور کیا تم نے انسانی زندگی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ انسان ایک ایسے حقیر و ذلیل خوردبینی کیڑے کی شکل میں کسی دوسرے آدمی کے بدن کا حصہ تھا کہ شاید کوئی نازک مزاج شخص اسے دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ لیکن آج وہی ہے کہ ایک خوبصورت دلکش اور دل و دماغ کی اعلیٰ ترین طاقتوں سے آراستہ وجود بنا بیٹھا ہے۔ آؤ اب ذرا آسمان کیطرف بھی ایک نظر اٹھا کر دیکھو۔ یہ سورج یہ چاند یہ ستارے یہ تمہارے سامنے کیا منظر پیش کرتے ہیں۔ سورج ہی کو لے لو کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ سورج تمہاری زمین سے کتنے فاصلہ پر ہے۔ سنو اس کا فاصلہ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اور اگر حیران نہ ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ اجرام سماوی میں سے تمہارا یہ سورج ان ستاروں میں سے ہے جو نسبتاً زمین کے بہت قریب ہیں کیونکہ بعض ستاروں کا زمین سے اتنا فاصلہ ہے کہ اس کے اظہار کے لئے تمہاری زبان میں کوئی عدد تک مقرر نہیں پھر یہ بھی جانتے ہو کہ سورج کا حجم کتنا ہے یہ بھی سن لو۔ تمہاری یہ زمین جسکی وسعت پر تمہیں اتنا ناز ہے۔ اور جو باوجود گول ہونے کے اپنی عظیم الشان وسعت کی وجہ سے چپٹی نظر آتی ہے۔ سات ہزار نو سو چھبیس میل کا قطر رکھتی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں سورج کا قطر آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار میل ہے۔ لیکن اگر حیران نہ ہو تو میں پھر تم سے یہ بھی کہدوں کہ آسمانی ستاروں میں سے بہت سے ستارے ایسے ہیں جنکے سامنے یہ سورج حجم کے لحاظ سے اتنی بھی حقیقت نہیں رکھتا جیسے ایک ڈبہ کے مقابلہ میں پدی کی۔

حقیقت ہے۔ یہ تو ان فضا نشینوں کی ظاہری شکل وصورت کا حال ہے۔ اور اگر اس عظیم الشان نظام کا مطالعہ کیا جاوے جسکے ماتحت یہ لاکھوں کروڑوں عالم فضاء آسمانی میں چکر لگا رہے ہیں تو عقل انسانی خود چکر میں آنے لگتی ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ ہر ستارہ و سیارہ اپنے دائرہ کے اندر اپنے اپنے قواعد کے ماتحت چکر لگا رہا ہے اور کیا مجال ہے کہ ایک ستارہ کسی دوسرے ستارے سے ٹکرا جاوے یا اپنے دائرہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے دائرہ کے اندر جا داخل ہو اور یہ قاعدہ صرف اجرام سماوی ہی کے متعلق نہیں۔ بلکہ زمین پر بھی ہر چیز اپنے اپنے حلقہ کے اندر محصور ہے اور یہ کسی کو طاقت نہیں کہ اپنے حلقہ سے آزاد ہو کر دوسرے حلقے میں داخل ہو سکے۔ آگ کا کام ہے کہ جلا دے۔ پانی کا کام ہے کہ بجھا دے۔ درخت کا کام ہے کہ زمین میں ایک جگہ استادہ کھڑا رہے۔ پرندہ کا کام ہے کہ ہوا میں اُڑتا پھرے۔ انسان کا کام ہے کہ زمین پر چلے۔ مچھلی کا کام ہے کہ پانی میں تیرے۔ گائے کا کام ہے کہ گھاس کھائے۔ شیر کا کام ہے کہ دوسرے جانوروں کو اپنی خوراک بنائے۔ یہ موٹی موٹی مثالیں ہیں ورنہ ہر چیز اپنے خواص اور اپنی طاقتوں اور اپنے کام کے لحاظ سے اپنے اپنے حلقہ کے اندر محصور ہے اور اپنے حلقہ سے باہر نکل جانے کی کسی کو طاقت نہیں۔ اور پھر ہر چیز ایک خاص غرض و مقصد کو پورا کر رہی ہے۔ اب غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ عظیم الشان نظام جس سے زمین و آسمان کی کوئی چیز باہر نہیں خود بخود اپنے آپ سے ہے؟ کیا یہ حکیمانہ قانون جو ہر چیز میں کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ خود بخود بغیر کسی بالا ہستی کے تصرف کے جاری ہے؟ کیا یہ زمین معہ اپنی لاتعداد مخلوقات کے۔ اور یہ آسمان معہ اپنے بے شمار اجرام کے اپنے خالق اور اپنے رب آپ ہی ہیں؟ اس وقت اس سوال کو چھوڑو کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ صرف اس بات کا جواب دو کہ تمہارا دل اس بات پر واقعی اطمینان پاتا ہے۔ کہ یہ کائنات اور یہ نظام بغیر کسی خالق بغیر کسی رب بغیر کسی مالک بغیر کسی متصرف کے خود بخود اپنے آپ سے ہے؟ میں یہ نہیں پوچھتا کہ تم کسی خدا پر ایمان لاتے ہو یا نہیں بلکہ میرا سوال صرف یہ ہے کہ کیا تم دیانتداری کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ یہ زمین یہ آسمان یہ حیوانات یہ نباتات یہ جمادات یہ اجرام سماوی محض کسی اتفاقی قانون کا نتیجہ ہیں؟ کیا یہ عظیم الشان نظام جس نے دنیا کی اربوں چیزوں کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے بغیر کسی رب اور متصرف کے خود بخود چل رہا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص جو آدم کی

اولاد سے ہے اور دل ودماغ رکھتا ہے اس بات پر تسلی پا سکتا ہے کہ یہ کائنات جو اس قدر گوناگوں عجائبات کا مجموعہ ہے تو دبخود اپنے آپ سے ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ تمام کائنات مع اپنے حکیمانہ نظام کے خدا تعالیٰ کی ہستی کی ایک ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی عقلمند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا ۔

اس وقت تک ہم نے دنیا کی مختلف چیزوں اور ان کے حصوں کو انفرادی صورت میں لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں ایسی عجیب و غریب ہستی ہے اور ایسے حکیمانہ قانون کے ماتحت چل رہی ہے کہ انسان مجبور ہوتا ہے کہ دنیا کی پیدائش کو ایک علیم اور قدیر اور حکیم اور متصرف ہستی کیطرف منسوب کرے لیکن جب ہم کسی ایک چیز کے مختلف حصوں کے آپس کے تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں یا مختلف چیزوں کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر یہ دلیل اور بھی زیادہ روشن ہو کر ہمارے سامنے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ہم اونٹ کو لیتے ہیں اور بالفرض یہ مان لیتے ہیں کہ قانون قدرت کے کسی مخفی قاعدہ کے ماتحت اس کو لمبی ٹانگیں مل گئیں یعنی اونٹ کو لمبی ٹانگوں کا ملنا نیچر کے کسی قانون کا نتیجہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس اندھے قانون کو یہ کیسے پتہ لگ گیا کہ اب جو میں نے اسے لمبی ٹانگیں دی ہیں تو اسکی گردن بھی لمبی بنانی چاہیئے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ زمین تک پہنچ سکے۔ اور پھر صرف اونٹ میں ہی نہیں بلکہ ہر جانور میں یہی حکیمانہ قاعدہ جاری کر دیا کہ جہاں کسی مصلحت سے ٹانگیں لمبی دی جاویں وہاں گردن بھی لمبی ہو اور جہاں ٹانگیں چھوٹی ہوں وہاں گردن بھی چھوٹی ہو۔ یہ صرف ایک موٹی مثال ہے ورنہ غور کیا جاوے تو دنیا میں ہر چیز کے مختلف حصے اس تناسب اور موزونیت کے ساتھ باہم جوڑے گئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پھر ذرا اور آگے چلیں تو اس سے بھی بڑھ کر عجیب و غریب اور دلکش منظر نظر آتا ہے قانون قدرت کے کسی اتفاقی کرشمہ نے مرد کی پشت میں نسل انسانی کے کیڑے پیدا کر دیئے اور پھر اس قانون نے ہی مرد اور عورت کے اندر یہ خواہش پیدا کر دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور اسی نے ہی مرد کی پشت کے وہ کیڑے عورت کے تاریک و تار رحم میں پہنچا دیئے۔ اور پھر اسی قانون نے ہی نو ماہ تک ان میں سے ایک کیڑے کو منتخب کر کے اسکی تربیت کی اور اسے ایک دل و دماغ رکھنے والا خوبصورت شکل کا بچہ بنا دیا۔ اور اسی نے ہی پھر اس بچے کو ماں کے پیٹ سے باہر

نکالا۔گویا کہ اس کیڑے کے اندرونی تغیرات سب اسی اتفاقی قانون قدرت کے ماتحت وقوع
میں آگئے۔ مگر خدارا مجھے یہ سمجھادو۔ کہ اس اندھے قانون کو کہاں سے سوجھی کہ جب وہ بچہ ماں کے
رحم سے آنے والا ہوا تو اس نے اسکی خوراک کے واسطے ماں کی چھاتیوں میں دودھ پیدا کر دیا تاکہ
پیشتر اسکے کہ بچہ اس دنیا کی روشنی دیکھے اسکی خوراک پہلے سے اس دنیا میں موجود ہو۔ ماں کی
چھاتیاں تو بچے کے جسم کا حصہ نہیں۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اس بچے کی خاطر دوسری جگہ ماں کی چھاتیاں
اُبھرنی شروع ہوگئیں۔ سبحان اللہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ٭

پھر اور سنو۔ زمین خود بخود پیدا ہوگئی۔ اس پر چلنے پھرنے والی چیزیں بھی خود بخود پیدا ہو
گئیں۔ انسان بھی اپنے آپ نیست سے ہست میں آگیا۔ اسکے ناک کان۔ آنکھ سب تو دبخود ظاہر
ہوگئے۔ الغرض یہ سب کچھ کسی اتفاقی قانون کے نتیجہ میں ہوگیا لیکن یہ کس طرح ہوا کہ آنکھوں میں
جو دیکھنے کی طاقت تھی اس کے ظاہر کرنیکے لئے اس قانون نے نو کروڑ میل کے فاصلہ پر ایک
عظیم الشان چراغ بھی روشن کر دیا تاکہ اسکی روشنی زمین پر پہنچے۔ اور پھر انسانی آنکھ اپنی قوت
بینائی کو استعمال کرسکے۔ درخت تو زمین پر اُگ آیا اس کے تخم بھی پیدا ہوگئے وہ تخم زمین پر گر کر
بوئے بھی گئے لیکن یہ کس نے سوچا کہ ان تخموں کے اُگنے کے واسطے پانی کی بھی ضرورت ہے
اور پھر یہ کس نے انتظام کیا کہ سمندر پر سورج کی شعاعیں گرائیں اور وہاں سے کروڑوں ٹن پانی
اُٹھا کر ہواؤں کے ذریعہ زمین کے جھلستے ہوئے میدانوں تک پہنچا دیا۔ اور پھر وہاں ان ہواؤں
کو بادل کی صورت میں لاکر بارشیں برسادیں۔ اگر یہ سب کچھ اسی اتفاقی قانون نے کیا۔ اور
یہی قانون وہ ہستی ہے جو خالق ہے مالک ہے رب ہے علیم ہے۔ قدیر ہے حکیم ہے متصرف ہے
مہیمن ہے۔ جو غور کرتی اور سوچتی ہے جو حالات کی مناسبت کا خیال رکھتی ہے جو اگر ضرورت پیدا
کرتی ہے تو دوسری جگہ اس کے پورا کرنے کا سامان بھی پیدا کر دیتی ہے تو ہمیں ناموں سے کچھ
سروکار نہیں۔ پھر وہی ہمارا خدا ہے اور اسی کے سامنے ہم محبت و عبودیت کا سجدہ بجالاتے
ہیں۔ غرض کسی طریق کو بھی اختیار کیا جاوے اس بات کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ یہ کائنات
اور اس کا حکیمانہ نظام ایک ایسی ہستی کیطرف اشارہ کر رہا ہے جو خالق ہے مالک ہے حکیم ہے علیم ہے
قدیر ہے متصرف ہے غرض ان تمام صفات سے متصف ہے جو مذہب خدا کیطرف منسوب کرتا ہے

اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے علمی اصطلاحات اور پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے محض سادہ اور مخلوط طور پر اس دلیل کو بیان کیا ہے تاکہ ہمارے نوجوان عزیز اسے آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں لیکن اس دلیل کو علمی طور پر بھی بیان کیا جا سکتا ہے جو مختصراً یہ ہے کہ نیچر کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا کی لاتعداد مختلف اشیاء میں انفرادی طور پر بھی اور مجموعی طور پر بھی تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل دنیا کی ہر چیز میں کیا بلحاظ اپنی ذات کے اور کیا بلحاظ دوسری چیزوں کے ساتھ اسکے تعلقات میں ایک نہایت دلفریب اور کامل قانون جاری ہے جسے انگریزی میں لاز آف نیچر (Laws of Nature) کہتے ہیں اور یہ قانون اگر اس کو صحیح طور پر مطالعہ کیا جاوے تو صانع عالم کے وجود پر ایک زبردست دلیل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے خود اسی قانون کو اپنے لئے ٹھوکر کا موجب بنا رکھا ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ دوسرے دنیا کی ہر چیز میں اور نیز اس حکیمانہ قانون میں جو نیچر میں کام کر رہا ہے انفرادی طور پر اور مجموعی طور پر ایک خاص معیّن نقشہ اور ترتیب نظر آتی ہے جسے دیکھتے ہوئے کوئی دانا شخص اسے ہرگز اتفاق کیطرف منسوب نہیں کر سکتا۔ اس نقشہ اور ترتیب کو انگریزی میں ڈیزائن (Design) کہتے ہیں۔ تیسرے دنیا کی ہر چیز معہ اپنے قانون اور ڈیزائن یا پلین کے ایک خاص غرض وغایت کے ماتحت کام کرتی ہوئی ثابت ہوتی ہے یعنی اس عالم دنیوی کی ہر چیز میں ایک علّت غائی نظر آتی ہے اور اس علم کو انگریزی میں ٹیلی آلوجی (Teleology) کہتے ہیں۔ اور یہ علّت غائی ذات باریتعالیٰ کا ایک نہایت زبردست ثبوت ہے۔ مختصر یہ کہ نظام عالم کا مطالعہ بڑے زور کے ساتھ انسان کو اس طرف مائل کرتا ہے کہ یہ دُنیا خود بخود اپنے آپ سے نہیں ہے بلکہ ایک بالا مدرک بالارادہ ہستی کے دست قدرت سے عالم وجود میں آئی ہے وھو المراد +

سائنس اور خدا کا عقیدہ

اس بحث کے ختم کرنے سے قبل میں کچھ مغربی محققین کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں جو ہر بات کو سائنس کی روشنی میں مطالعہ کرنیکے عادی ہیں۔ سو جاننا چاہیئے کہ اہل مغرب میں سے جو لوگ اس زمانہ میں ہستی باریتعالیٰ کے منکر ہوئے ہیں وہ عموماً مسئلہ ارتقاء یعنی (Evolution) سے استدلال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ بیان ہے کہ مادہ کے اندر مختلف صورتیں اختیار

کر سکنے کا جو ہر طبعی طور پر پایا جاتا ہے اور مادہ میں یہ بھی ایک فطری خاصہ ہے کہ وہ ایک وقت تک ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کیطرف ترقی کرتا جاتا ہے چنانچہ وہ یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ مادی دُنیا اپنی موجودہ صورت میں کئی تبدیلیوں کے نتیجے میں جو اصول ارتقا کے ماتحت عمل میں آئی ہیں قائم ہوئی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ سے اسی شکل و ہیئت میں نہ تھا بلکہ کسی دُور کے گذشتہ زمانہ میں وہ ایک نہایت ہی ادنیٰ قسم کی چیز تھا جس نے آہستہ آہستہ ارتقا کر کے اپنی موجودہ شکل و صورت اختیار کی ہے۔ اسی طرح دنیا کی دوسری چیزوں کا حال ہے کہ وہ اپنی ابتدائی حالت میں بالکل ادنیٰ اور سادہ تھیں مگر بعد میں قانون ارتقا کے ماتحت آہستہ آہستہ ترقی کر گئیں۔ اسی طرح ان کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی اکثر چیزیں جو اس وقت مختلف جنسوں اور مختلف صورتوں اور مختلف خواص میں نظر آتی ہیں کسی زمانہ میں ان میں اتنا اختلاف نہ تھا بلکہ دنیا اپنی ابتدائی حالت میں صرف چند محدود سادہ چیزوں کی صورت میں تھی جن سے آہستہ آہستہ ارتقا کر کے یہ عجائب خانہ عالم پیدا ہوتا گیا پس موجودہ کائنات اور اسکے باریک اور مفصل اور حکیمانہ نظام کو کسی بیرونی صانع کی دلیل میں پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ سب قانون ارتقا کے ماتحت ظہور پذیر ہوا ہے۔ دوسرے وہ یہ کہتے کہ یہ دنیا ہمیشہ سے ایک خاص معین قانون کے ماتحت کام کرتی چلی آئی ہے، اور اب بھی دنیا کی ہر اک چیز ایک خاص قانون کے ماتحت چل رہی ہے اور ہم علمی تحقیق کے ذریعہ سے ہر تغیر اور ہر حرکت اور ہر سکون کی وجہ دریافت کر سکتے ہیں اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم روز بروز قانون نیچر اور خواص الاشیاء اور تعلقات مابین الاشیاء کی حقیقت تک پہنچتے جاتے ہیں اور سائنس کے مختلف شعبوں مثلاً فزکس اور کیمسٹری اور میکینکس اور ادرجی آلوجی اور باٹونی اور زوآلوجی اور اناٹومی اور فزی آلوجی اور اسٹرانومی اور سائکالوجی وغیرہ وغیرہ میں اس قدر ترقی ہو چکی اور ہوتی جاتی ہے کہ بے شمار حقائق جو اس سے قبل ایک راز سربستہ تھے بلکہ ہماری نظر سے بالکل ہی اوجھل تھے اب ایک منکشف شدہ حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں اور سینکڑوں غلط خیالات جو لاعلمی اور جہالت اور بیجا اتباع سلف کے نتیجہ میں ہمارے اندر قائم تھے۔ اب نئے علوم کی روشنی میں دُور ہوتے جاتے ہیں اور مسئلہ حیات اور فلسفۂ بقاء عالم کی اصل حقیقت دن بدن منکشف ہوتی جاتی ہے گویا جن باتوں کو

انسان پہلے زمانوں میں اپنی عقل و فہم سے بالا سمجھ کر کسی بالا ہستی کیطرف منسوب کر دیتا تھا۔
اب ہم انہی باتوں کو نئے علوم کی روشنی میں کسی معین قانون نیچر کا نتیجہ ثابت کر سکتے ہیں لہذا
اس کارخانہ عالم کو کسی خدا وغیرہ کیطرف منسوب کرنا جسے نہ کسی نے دیکھا اور نہ محسوس کیا ایک
جہالت کا خیال ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو مغرب کے محققین کیطرف سے ہستی باریتعالیٰ کے خلاف
پیش کیا جاتا ہے لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو یہ اعتراض ایک جہالت کا اعتراض ہے
مسئلہ ارتقاء جسکی تفصیلات میں ہمیں اس جگہ پڑنے کی ضرورت نہیں اور قطع نظر اسکے کہ وہ صحیح
ہے یا غلط ہے یا کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط۔ ذات باریتعالیٰ کے خلاف ہرگز بطور
دلیل کے پیش نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ مسئلہ کائنات کے حقیقی آغاز کے متعلق کوئی روشنی
نہیں ڈالتا۔ بلکہ اس کا تعلق صرف اس بات سے ہے کہ دنیا کی موجودہ چیزیں ہمیشہ سے اسی
طرح نہیں بلکہ ایک ادنیٰ حالت سے ترقی کر کر کے اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں لیکن یہ سوال کہ
وہ ابتدائی ادنیٰ حالت کی چیزیں کہاں سے آئیں اسکے متعلق حامیان مسئلہ ارتقا علمی طور پر کوئی
روشنی نہیں ڈالتے۔ اور ظاہر ہے کہ جبتک اس دنیا کی ابتدائی پیدائش کے متعلق کوئی روشنی
نہ ڈالی جاوے محض مسئلہ ارتقا کو خدا کے انکار کے ثبوت میں پیش کرنا قطعاً کوئی اثر نہیں رکھتا
کیا صرف اس بات کے ثابت ہو جانے سے کہ انسان یا اس دنیا کی دوسری چیزیں ابتدائی زمانہ
میں کسی ادنیٰ قسم کی حالت میں تھیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتی کرتی موجودہ حالت کو پہنچیں۔ یہ
استدلال جائز ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنیوالا کوئی نہیں ہے؟ ہرگز نہیں اور اگر یہ کہا جاوے
کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ دنیا اپنی ابتدائی صورت میں بہت سادہ تھی۔ اور پھر مادہ کے اندرونی
خواص کے ماتحت وہ زیادہ اعلیٰ اور مکمل صورت اختیار کرتی گئی۔ تو کم از کم اس سے یہ دلیل تو باطل
ہو گئی جو اوپر دی گئی ہے کہ چونکہ موجودہ کائنات جو بے شمار مختلف چیزوں کا مجموعہ ہے ایک نہایت
لطیف اور حکیمانہ قانون کے ماتحت کام کر رہی ہے اس لئے معلوم ہوا کہ وہ کسی بیرونی صانع اور
منصرف ہستی کے ماتحت ہے تو یہ بھی ایک جہالت کی بات ہو گی۔ کیونکہ ان ابتدائی ادنیٰ حالت
کی چیزوں کے اندر ان خواص کا پایا جانا کہ وہ ترقی کر کر کے ایک عجیب و غریب کائنات کی صورت
اختیار کر لیں۔ اور اس ترقی کے ساتھ ساتھ ہی ایک نہایت ہی پر حکمت قانون بھی انکے متعلق

پیدا ہوتا چلا جاوے۔ خود سب عجوبوں سے بڑھ کر عجوبہ ہے بلکہ اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو اس مادی دنیا کی وہ ابتدائی حالت جو بیان کی جاتی ہے (قطع نظر اسکے کہ وہ درست ہے یا نہیں) موجودہ کائنات سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور عقل انسانی کو دنگ کرنیوالی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ ابتدائی حالت موجودہ دنیا کے لئے بطور تخم کے تھی اور ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ تخم درخت کی نسبت زیادہ عجیب و غریب اور زیادہ پرحکمت چیز ہوتا ہے کیونکہ اس کے اندر باوجود اسکے کہ وہ حجم میں نہایت چھوٹا اور صورت میں نہایت سادہ ہوتا ہے۔ وہ تمام طاقتیں اور تمام خواص اور تمام کمالات بالقوہ مخفی ہوتے ہیں جو بعد میں درخت کے اندر بالفعل رونما ہوتے ہیں۔ پس اس دنیا کا اپنی ابتدائی حالت میں بہت ادنیٰ اور سادہ ہونا اس کائنات کو اور بھی زیادہ پرحکمت اور عجیب و غریب چیز ثابت کرتا ہے اور خالق فطرت کی ہستی پر ایک مزید دلیل پیدا ہوتی ہے کہ کس طرح اس نے مادہ کی اس ابتدائی ادنیٰ حالت میں یہ مخفی طاقتیں ودیعت کر دیں کہ وہ آہستہ آہستہ ایک نہایت عظیم الشان اور پررعب و پرحکمت عالم کی صورت اختیار کر گیا اور پھر اسکے ساتھ ساتھ ہی کس طرح اسکے اندر سے ایک ایسا مکمل اور حکیمانہ قانون بھی پیدا ہوتا گیا کہ جسکے ماتحت آج دنیا کی بیشمار عجیب و غریب چیزیں اپنے اپنے دائرہ کے اندر کام کرتی ہوئی لوگوں کی عقلوں کو محو حیرت کر رہی ہے۔ لہذا یہ ایک نادانی ہے کہ مسئلہ ارتقا سے خدا تعالیٰ کے خلاف استدلال کیا جاوے بلکہ حق یہ ہے کہ اس مسئلہ سے اسکی پرحکمت قدرتوں اور بے نظیر صنعت پر آگے سے بھی زیادہ روشنی پڑ گئی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ دنیا کی ہر اک چیز اور ہر تغیر اور ہر سکون ایک خاص قانون کے ماتحت ہے اور ہم اب دن بدن اس مخفی قانون قدرت پر زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرتے جاتے ہیں اور اس بات پر روشنی پڑتی جاتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیچر کے کسی معین قانون کے ماتحت ہو رہا ہے جس سے ثابت ہوا کہ جو کچھ ہے یہی قانون ہے خدا وغیرہ کوئی نہیں۔ سو یہ اعتراض بھی ایک بیہودہ اور کمزور اعتراض ہے۔ ہم نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ دنیا کسی قانون یا سلسلہ اسباب کے ماتحت نہیں ہے اور بلا کسی درمیانی سبب کے اور بلا کسی قانون کے خدا کے بلا واسطہ تصرف سے چل رہی ہے۔ ہم تو خود اس بات کے مقر بلکہ مدعی ہیں اور اسلام ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ عالم ایک نہایت درجہ حکیمانہ قانون اور

باریک در باریک سلسلہ اسباب کے ماتحت کام کر رہا ہے بلکہ اسی دلیل میں ہم نے اس قانون کو ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ پس یہ ثابت کرنا کہ دُنیا کی ہر اک چیز ایک خاص معیّن قانون کے ماتحت ہے۔ ہمارے خلاف کوئی اثر نہیں رکھ سکتا۔ سوال تو یہ ہے جس کا آجتک کوئی سائنس دان جواب نہیں دے سکا۔ کہ یہ کامل و مکمل قانون کہاں سے آیا ہے؟ بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ یہ قانون مادہ کا طبعی خاصہ ہے اور نیز یہ کہ ایک قانون دوسرے قانون کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا چلا آیا ہے اور اسی طرح چلتا چلا جاوے گا۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ طبعی خاصہ کہاں سے آیا اور پھر یہ کہ بیشک ایک قانون دوسرے قانون کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے لیکن بہر حال اس سبب اور مسبب کے سلسلہ کو خواہ کتنا بھی لمبا کھینچا جاوے آخر اسکی کوئی نہ کوئی ابتدا ماننی پڑیگی جس سے یہ سب کچھ نکلا ہے۔ مثلاً سائنس دان کہتے ہیں کہ نیچر کا یہ ایک قانون ہے کہ زمین سورج کے ارد گرد چکر لگاتی ہے اور پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ قانون نتیجہ ہے میکینکس کے ایک اور قانون کا کہ جب ایک چیز پر دو یا دو سے زیادہ مختلف الجہت طاقتیں اثر ڈالتی ہیں تو وہ چیز ایک تیسری جہت میں جو ان مختلف الجہت طاقتوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے حرکت کرنے لگ جاتی ہیں اور زمین پر بھی چونکہ مختلف الجہت طاقتیں اثر ڈال رہی ہیں۔ اس لئے وہ ان طاقتوں کے نتیجہ میں ایک تیسری جہت پر چل کر سورج کے گرد چکر کھانے لگ گئی ہے ہم اس بات کو مانتے ہیں لیکن ہمارا سوال پھر اسی طرح قائم ہے کہ یہ اثر ڈالنے والی طاقتیں کہاں سے آئی ہیں؟ اگر کہا جاوے کہ یہ طاقتیں فلاں بات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں تو پھر یہ سوال ہوگا کہ یہ "فلاں بات" کہاں سے آئی ہے۔ الغرض موجودہ کائنات اور موجودہ نظام کا کوئی ابتدائی تخم تسلیم کرنا پڑے گا جسکے اندر بالقوہ طور پر وہ سارے کمالات اور قوانین اور خواص موجود ماننے ہونگے۔ جو اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ پس اس طرح بھی بحث اسی ارتقا والے مسئلہ پر آگئی جس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے +

خلاصہ کلام یہ کہ ان درمیانی قوانین اور ان درمیانی تغیرات کو پیش کر کے خدا کے وجود سے انکار کی راہ تلاش کرنا ایک دھوکے کا طریق ہے جس میں مغرب کے علم پسند طبقے نے نہ معلوم

کس طرح تسلی بار کھی ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں علمی تحقیقاتوں میں ترقی ہوتی جاتی اور قانون نیچر کے مخفی حقائق منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارا دل عقلی طور پر زیادہ سے زیادہ بصیرت کیسے ساتھ اس ایمان پر قائم ہوتا جاتا ہے کہ یہ کارخانہ عالم معہ اپنے نہایت درجہ حکیمانہ قانون کے ضرور کسی خالق و مالک علیم و حکیم قدیر و متصرف ہستی کے ماتحت چل رہا ہے۔ اگر ایک معمولی چیز کو دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ کسی صانع کی پیدا کردہ ہے تو ایک عجیب و غریب پُر حکمت چیز کو دیکھ کر بدرجہ اولیٰ ہمارے اندر یہ ایمان پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ خود بخود نہیں بلکہ کسی بالا ہستی کی قدرت نمائی کا کرشمہ ہے۔ میرے عزیزو خوب غور کر لو کہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقاتوں کا سوائے اسکے اور کوئی اثر نہیں ہو سکتا کہ یہ ثابت ہو کہ دُنیا و مافیہا کا قانون اس سے بہت بڑھ چڑھ کر مفصل اور حکیمانہ ہے جو اس زمانہ سے پہلے سمجھا جاتا تھا اور یہ کہ دنیا کی مختلف چیزیں صرف اپنے الگ الگ قانون ہی کے ماتحت نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی بھی ایک حکیمانہ قانون کی لڑی میں پروئی ہوئی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ اور نیز یہ کہ دُنیا کی کوئی چیز فضول اور زائد نہیں بلکہ ہر ایک اپنے اپنے حلقہ میں اپنے اپنے قانون کے ماتحت اپنا اپنا کام کر رہی ہے مگر یہ انکشاف اگر اسے انکشاف کہا جاوے ہماری تائید میں ہے نہ کہ ہمارے مخالف۔ کیونکہ اس سے خدا کے خلاف کوئی دلیل نہیں پکڑی جا سکتی بلکہ اس سے ہمارے خدا کی حکیمانہ قدرتوں کے کرشموں کا بیش از پیش اظہار ہوتا چلا جاتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اصولی طور پر یہ انکشافات کوئی نیا انکشاف نہیں۔ بلکہ قرآن شریف آج سے تیرہ سو سال قبل اجمالاً اس حقیقت کو آشکار کر چکا ہے چنانچہ فرماتا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (نحل) وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (انبیاء) یعنی "کیا لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی طرف نہیں دیکھتے کہ دُنیا کی ہر ایک چیز خدا کے حکم کے ماتحت مطیع و فرمانبردار ہو کر اپنے دائیں بائیں اثر ڈال رہی ہے اور جو کچھ کہ زمین و آسمان میں ہے خدا کے مقرر کردہ قانون کے ماتحت چل رہا ہے اور ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ کہ ان میں ہے بے غرض اور باطل طور پر نہیں پیدا کیا" یہ وہ حقیقت ہے جسکی تفصیلات کی دریافت کے واسطے یورپ و امریکہ کے

محققین آج اپنی عمریں صرف کر رہے ہیں لیکن بوجہ اسکے کہ انکی دین کی آنکھیں بند ہیں ان میں سے بعض اپنی بد قسمتی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ انکی یہ تحقیقاتیں مذہب اور خدا کے وجود پر ایک حملہ ہیں حالانکہ حق یہ ہے کہ نظام عالم اور قانون نیچر کا جتنا بھی کمال ظاہر ہوتا جاتا ہے اتنا ہی یہ عالم سفلی اہل بصیرت کے نزدیک ایک حکیم و علیم قدیر و متصرف خالق کیطرف اشارہ کرنے میں زیادہ وضاحت اختیار کرتا جاتا ہے چنانچہ خود مغربی محققین میں بھی ایک کافی طبقہ ان لوگوں کا ہے جو خدا پر ایمان لاتے ہیں اور یہ جدید تحقیقاتیں ان کے اس ایمان کے رستہ میں قطعاً کوئی روک نہیں ہوتیں۔ بلکہ انہیں وہ دہریت کے خلاف بطور ایک حربہ کے استعمال کرتے ہیں۔ پس اے میرے عزیزو تم ان علوم جدیدہ سے مت گھبراؤ کیونکہ یہ سب تمہارے خادم ہیں اور ان کا سوائے اسکے اور کوئی اثر نہیں کہ تمہارے خدا کی حکیمانہ قدرت نمائیوں کے کرشمے زیادہ سے زیادہ وضاحت اور یقین کے ساتھ لوگوں کی نظروں کے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اور دنیا پر یہ بات علم الیقین کے طور پر ثابت ہوتی چلی جا رہی ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کے لئے ہے جیسا کہ آج سے تیرہ سو سال قبل قرآن شریف فرما چکا ہے ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا نیز فرماتا ہے وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی "جو کچھ کہ دنیا میں ہے وہ تمہارے فائدہ کے واسطے ہے اور اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم انکے حقائق سے آگاہ ہو کر ان سے فائدہ اٹھاؤ" مگر افسوس انسان پر کہ جن چیزوں کو انکے آقا و مالک نے اسکی ہدایت اور ترقی کے لئے پیدا کیا تھا انہی کو اس نے اپنی گمراہی اور ہلاکت کا سبب بنا رکھا ہے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ ؁

اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ دراصل یہ سوال کہ کوئی خدا موجود ہے یا نہیں سائنس کے دائرہ عمل سے بالکل باہر ہے۔ اور کوئی سائنس دان اپنے حلقہ میں رہ کر امکاناً اس بحث میں پڑ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سائنس صرف مادیات کے خواص اور قوانین کے دریافت کا علم ہے اور غیر مادی اشیاء کی بحث اسکے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ علاوہ ازیں سائنس کو اس بات سے تعلق نہیں کہ کونسی چیز نہیں ہے بلکہ اسے اس بات سے سروکار ہے کہ کونسی چیز ہے

اور پھر یہ کہ جو چیز ہے وہ کیا ہے اور کس قانون کے ماتحت ہے پس یہ حقیقت کہ خدا نہیں ہے
امکانی طور پر سائنس کی بحث سے بالکل خارج ہے ہاں البتہ یہ بحث سائنس کے دائرہ عمل میں
آسکتی ہے کہ یہ دنیا اور اسکی چیزیں کس طرح عالم وجود میں آئی ہیں اور حیات کا آغاز کس طرح ہوا
ہے پس سائنس دان زیادہ سے زیادہ امکانی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے یہ پتہ لگا لیا ہے کہ
دنیا ہمیشہ سے ہے اور نظام عالم خود بخود ایک قانون کے سلسلہ کے ماتحت ہے جو وہ بھی خود
بخود ہی چل رہا ہے اور حیات کا بھی خود بخود آغاز ہو گیا ہے اور اس تحقیق سے نتیجۃً وہ یہ عقلی
استدلال کر سکتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے مگر خدا کا نہ ہونا خود بلا واسطہ اپنی ذات میں کبھی بھی
سائنس کی تحقیق میں نہیں آسکتا +

علاوہ ازیں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ بد قسمتی سے عموماً لوگ
(الف) سائنس دانوں کے خیالات و قیاسات اور (ب) سائنس کے نامکمل تجربات اور مشاہدات
اور (ج) سائنس کے ثابت شدہ حقائق میں تمیز نہیں کرتے۔ اور ہر اک بات کو جو سائنس دانوں
کے منہ سے نکلتی ہے یعنی ہر اک خیال کو جس کا انکی طرف سے اظہار کیا جاتا ہے اور اسی طرح تمام
ان نامکمل تجربات اور مشاہدات کو جن کا سائنس دانوں کیطرف سے اعلان ہوتا رہتا ہے۔
سائنس کی ثابت شدہ حقائق قرار دے لیتے ہیں اور اس طرح بجائے صداقت کی اتباع اختیار
کرنیکے اپنی جہالت کی وجہ سے سائنس دانوں کی شخصی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے
ہیں۔ حالانکہ ہر اک شخص جو تھوڑا بہت علم رکھتا ہے جانتا ہے کہ سائنس کے ثابت شدہ حقائق
صرف وہی قرار دیئے جاتے ہیں کہ جو مختلف سائنس دانوں کے ہاتھ پر بار بار کے تجربات
سے روز روشن کیطرح مشاہدہ میں آچکے ہیں اور آتے رہتے ہیں اور جنکی حقیقت علمی طور پر
بھی سبب اور مسبب کے رنگ میں ثابت و قائم ہو چکی ہے اور انکے علاوہ جو سائنس دانوں کے
باقی نامکمل تجربات ہیں یا وہ خیالات اور تصویریاں ہیں جو وہ ثابت شدہ حقائق سے استدلال
کر کے قائم کرتے ہیں وہ ہرگز ثابت شدہ حقائق نہیں کہلا سکتے کیونکہ ان میں اتنا ہی غلطی کا
احتمال ہے جو دوسرے سمجھدار اور دانا لوگوں کی باتوں کے متعلق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی
نئی بات سائنس کے تجربات کی رو سے مشاہدہ میں آکر دریافت ہوتی ہے اور پھر مختلف لوگوں

کے بار بار کے تجربات سے جو مختلف حالات کے ماتحت کئے جاتے ہیں وہ پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اور علمی طور پر بھی اسکے کسی پہلو کے متعلق تاریکی نہیں رہتی تو تب جاکر وہ ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھی جاتی ہے اور اس مقام سے قبل قبل گو سائنس کے بعض تجربات سے اسپر روشنی پڑتی ہو۔ اور بعض سائنس دان اسکے قائل بھی ہو گئے ہوں مگر وہ ایک ثابت شدہ حقیقت قرار نہیں دی جاسکتی۔ لیکن بد قسمتی سے عوام الناس ان ہر دو قسم کی باتوں میں تمیز نہیں کرتے اور سب کو ہی سائنس کے ثابت شدہ حقائق سمجھ کر انکے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر اندھیر یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقاتوں کی بنا پر جو خیالات اور تھیوریاں سائنس دان قائم کرتے ہیں وہ بھی سائنس کے حقائق قرار دے لئے جاتے ہیں گویا تین مختلف چیزوں کو جو ایک دوسرے سے بالکل ممتاز و متغائر ہیں مخلوط کر دیا جاتا ہے اور اس طرح پر سائنس جس کا کام نسل انسانی کے دماغوں کو علمی روشنی پہنچانا ہے بعض اوقات جہالت اور تاریکی کا موجب ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی بات سائنس کے تجربات اور مشاہدات کی رُو سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے تو پھر اسکی بنا پر طبعاً دنیا کے علمی طبقہ میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اور مختلف سائنس دان اس جدید تحقیق کی روشنی میں مختلف خیالات اور مختلف تھیوریاں قائم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح ہر جدید تحقیق کے ساتھ جدید خیالات اور جدید تھیوریوں کا وجود پیدا ہوتا جاتا ہے اور ناواقف لوگ سائنس کے لفظ سے مرعوب ہو کر یا کسی اور وجہ سے اس سارے رطب و یابس کے مجموعہ کو ہی سائنس کی ثابت شدہ حقیقت قرار دینے لگ جاتے ہیں حالانکہ اصل ثابت شدہ حقیقت بہت تھوڑی ہوتی ہے اور باقی سب سائنس دانوں کی تھیوریاں اور قیاسات و خیالات ہوتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ آئے دن بدلتے رہتے ہیں بلکہ ان کے متعلق خود سائنس دانوں میں بھی ہمیشہ اختلاف رہتا ہے۔ الغرض یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ سائنس کے (الف) ثابت شدہ حقائق اور (ب) نامکمل تجربات میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اور نہ ہی (ج) سائنس دانوں کے خیالات اور انکی استدلالی اور قیاسی تھیوریوں کو سائنس کے ثابت شدہ حقائق سے ممتاز سمجھا جاتا ہے بلکہ ہر اک بات جو کسی سائنس دان کے مُنہ یا قلم سے نکلتی ہے اسکے سامنے غلاموں کیطرح گردنیں جھکا دی جاتی ہیں اور بد قسمتی سے یہ ذہنی اور علمی

غلامی زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہی حصہ میں آئی ہے۔ ورنہ خود یورپ و امریکہ والے شوگا
ان تمام باتوں میں امتیاز ملحوظ رکھتے ہیں اور سائنس کے حقائق صرف انہی باتوں کو قرار دیتے ہیں جو
واقعی بار بار کے تجربات سے مشاہدہ میں آچکی ہیں اور علمی طور پر بھی انکے متعلق کوئی تاریکی کا پہلو
نہیں رہا۔ اب اگر اس اصل کے ماتحت سوال زیر بحث پر نظر ڈالی جاوے تو سائنس کی کوئی ایک
ثابت شدہ حقیقت بھی ایسی نظر نہیں آتی جسکی بنا پر ہستی باریتعالٰی کے متعلق کوئی اعتراض وارد
ہو سکتا ہو اور اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی جدید تحقیق واقعی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے
تو پھر کوئی سائنس دان اس کا منکر نہیں رہ سکتا کیونکہ پایۂ ثبوت کو پہنچنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ
صرف علمی طور پر یقین کی حد کو پہنچ جاوے بلکہ بار بار کے تجربات سے جو مختلف حالات کے ماتحت
کئے گئے ہوں۔ اس کا ایسے رنگ میں عملی مشاہدہ بھی ہو جاوے کہ پھر اس میں شک شبہ کی کوئی
گنجایش نہ رہے اور ظاہر ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر کوئی سائنس دان بلکہ کوئی شخص جو تھوڑا
بہت شعور رکھتا ہے اس کا منکر نہیں رہ سکتا۔ اور عملاً بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی ہر ثابت
شدہ حقیقت تمام سائنس دانوں کے نزدیک مسلّم ہے اور اختلاف صرف انہی باتوں میں ہے جو
یا تو ابھی تک پوری طرح ثابت نہیں ہوئیں اور یا صرف بعض سائنس دانوں کے خیالات اور قیاسات
ہیں جو انہوں نے ثابت شدہ حقائق کی بنا پر عقلی استدلالات سے تھیوریوں کی صورت میں قائم
کئے ہیں۔ الغرض سائنس کے ثابت شدہ حقائق کے متعلق قطعاً کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا لیکن
ہستی باریتعالٰی کے عقیدہ کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے سائنس دان خدا کے قائل ہیں بلکہ
دراصل اگر دیکھا جاوے تو بہت تھوڑے ان میں سے ایسے ہیں کہ جو خدا کا انکار کرتے ہیں
اور زیادہ وہ ہیں کہ جو انکار نہیں کرتے۔ پس ثابت ہوا کہ سائنس کی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی
نہیں ہے کہ جس سے یہ یقینی استدلال ہو سکے کہ یہ کارخانہ عالم خود بخود بغیر کسی خالق و مالک
کے چل رہا ہے ورنہ سائنس دانوں میں یہ اختلاف نہ ہوتا۔ وھو المراد۔ اور طرفہ یہ ہے
کہ یہ مسئلہ ارتقاء جسکے متعلق اتنا واویلا کیا جاتا ہے وہ خود ابھی تک سائنس کی ثابت شدہ
حقیقت نہیں ہے بلکہ صرف ایک تھیوری ہے *

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر آیندہ جاکر کوئی ایسی بات ثابت ہو جاوے جس سے یہ پتہ

لگے کہ یہ دُنیا و مافیہا خود اپنے آپ سے ہی ہے اور خود بخود ہی چل رہی ہے۔ تو پھر کیا جواب ہوگا تو اس کا یہ جواب ہے کہ اوّل تو یہ خیال ہی فضول بلکہ محض طفلانہ ہے کہ اگر یہ ہو جاوے تو کیا ہوگا اور وہ ہو جاوے تو کیا ہوگا۔ لیکن اگر اس سوال کو خواہ مخواہ پیدا ہی کرنا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم تو صداقت کے طالب ہیں جو بات بھی واقعی اور حقیقی طور پر ثابت ہو جاوے ہمیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے رسول صلعم (فداہ نفسی) کو ہمارا خدا فرماتا ہے کہ تو مسیحیوں کو کہدے کہ خدا بغیر کسی بیٹے کے ہے بلکہ اس کا بیٹا ماننا ایسا خطرناک فعل ہے کہ قریب ہے کہ اس سے زمین و آسمان تہ و بالا ہو جاویں لیکن باایں ہمہ تو مسیحیوں کو کہدے کہ اگر خدا کا کوئی بیٹا ثابت ہو تو أَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِيْنَ "میں سب سے پہلا شخص اسکی عبادت کرنیوالا ہونگا"۔ پس صداقت کی پیاس تو ہماری گھٹی میں ہے۔ جو اس دودھ سے ہمارے خون میں آئی ہے جو اُمّ القُریٰ کی چھاتیوں سے ہمیں پہنچا ہے۔ لہذا اصولی جواب تو ہمارا یہ ہے کہ جو بات بھی واقعی اور حقیقی طور پر ثابت ہوگی ہم اس پر ایمان لائینگے۔ لیکن حقیقی جواب یہ ہے کہ ایسی کوئی بات ہرگز ثابت نہیں ہو سکے گی کہ جو خدا تعالیٰ کے وجود کو شک و شبہ میں ڈال دے۔ کیونکہ ایسی بات کے ثابت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دو ثابت شدہ حقائق آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں جو ناممکن ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مثلاً سائنس کی رو سے ایک طرف تو یہ ثابت ہو کہ مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور پھر سائنس کی رو سے ہی دوسری طرف یہ بات بھی ثابت ہو کہ مقناطیس اسی حالت میں لوہے کو اپنی طرف نہیں کھینچتا؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کبھی بفرض محال ہمیں ایسا نظر آئے گا تو ہمیں ان دو حقیقتوں میں سے ایک کو غلط قرار دینا پڑے گا یعنی ایک کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ وہ دراصل کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ اسے غلطی سے ایسا سمجھ لیا گیا ہے پس اگر بفرض محال کبھی سائنس کی کوئی ایسی تحقیق ثابت بھی ہو جس سے یہ پتہ لگے کہ دُنیا کی یہ سب چیزیں خود بخود ہمیشہ سے ہیں اور خود بخود ہی یہ سارا انتظام چل رہا ہے تو پھر بھی ہم صرف اس وجہ سے ہرگز خدا کا انکار نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر یہ تحقیق سائنس کی تحقیق ہوگی تو خدا کا وجود بھی تو سائنس کے طریق سے ہی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک نام نہاد تحقیق کی وجہ سے دوسری ثابت شدہ حقیقت کو جسکی صداقت پر

ابتداء آفرینش سے مشاہدہ کی صورت میں مہر لگتی چلی آئی ہے ترک کردیں بلکہ اس صورت میں ہم پہلے یہ غور کرینگے کہ یہ جدید تحقیق جسے سائنس کی ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جاتا ہے کہاں تک درست اور قابل قبول ہے۔ خوب غور کرلو کہ سائنس کے حقائق کی پختگی صرف اس بنا پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اس میں علاوہ علمی اور عقلی دلائل کے تجربہ اور مشاہدہ پر بنا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب عقلی دلائل کے ساتھ تجربہ اور مشاہدہ مل جاتا ہے تو پھر کوئی غلطی کا احتمال (سوائے اسکے کہ مشاہدہ ناقص ہو) نہیں رہتا۔ اور واقعی یہ طریق تحقیق بہترین طریق ہے اور اسی لئے دنیاوی علوم میں سائنس کے ثابت شدہ حقائق اپنی پختگی میں سب پر فائق سمجھے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن دلائل کے ساتھ اس دنیا میں خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے وہ بھی اسی سائنس والے طریق پر مبنی ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے خدا کا وجود صرف عقلی دلائل سے ہی ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ سائنس کے حقائق کی طرح اسکی بنا بھی تجربہ اور مشاہدہ پر ہے بلکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ اپنی کمیت اور کیفیت میں سائنس کے حقائق سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ عقل کی پہنچ تو صرف اس حد تک ہے کہ یہ ثابت کرے کہ کوئی خدا ہونا چاہیئے اور اس سے اوپر کا مقام کہ واقعی خدا موجود ہے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اس تجربہ اور مشاہدہ کا سامان خود ذات باریتعالیٰ کیطرف سے پیدا کیا جاتا ہے جیساکہ فرمایا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ "یعنی خدا تک انسان کی آنکھ نہیں پہنچ سکتی (یعنی صرف عقلی دلائل سے خدا کا عرفان حاصل نہیں ہو سکتا) لیکن خدا خود انسانی آنکھ تک پہنچتا ہے" یعنی اپنی طرف سے ایسے سامان پیدا کرتا ہے کہ انسان کو خدا کا مشاہدہ ہوسکے تاکہ اس کا عرفان ناقص نہ ہے اور یہ سوال کہ یہ مشاہدہ کس طرح ہو سکتا ہے اس کا جواب آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان ہوگا۔ بہرحال خدا کے وجود کا ثبوت بھی سائنس کے حقائق کیطرح (گو اپنے کمال کی حالت میں وضاحت میں ان سے بہت بڑھ چڑھ کر) عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے پس اگر بفرض محال سائنس کی کوئی ایسی تحقیق ثابت بھی ہو جو ہستی باریتعالیٰ کے خلاف نظر آئے تو پھر بھی ہم خدا کا انکار نہیں کرینگے بلکہ پھر ہم اس جدید تحقیق کے متعلق غور کرینگے کہ وہ کہاں تک درست اور قابل قبول ہے اور ہمارے نزدیک اس غور کا نتیجہ سوائے اسکے اور کوئی نہیں ہو سکتا

کہ یہ بات ثابت ہو کہ خدا کا وجود برحق ہے اور سائنس کی یہ نام نہاد تحقیق جو اسکے خلاف نظر آتی ہے وہ یا تو درحقیقت اس کے خلاف نہیں اور یا پھر کسی ناقص مشاہدہ پر مبنی ہو کر غلط طور پر ثابت شدہ حقیقت قرار دے لی گئی ہے ورنہ دراصل وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ دراصل بات یہ ہے جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جاوے گا کہ خدا کا وجود ایسے کامل و مکمل مشاہدہ سے پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے کہ اسکے متعلق یہ کہنا کہ سائنس کی کوئی حقیقی تحقیق اس کے خلاف بھی ثابت ہو سکتی ہے دو متضاد باتوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے جو ناممکن ہے۔ سائنس اگر ہمارے مشاہدہ پر حملہ کرے تو وہ اپنی جڑھ پر اپنے ہاتھ سے کلہاڑا چلانے والی ٹھہرے گی کیونکہ اسکی اپنی بُنیاد مشاہدہ پر ہے۔ خیر یہ تو ایک زائد اور پیش از وقت سوال ہے کیونکہ آیندہ جو کچھ ہوگا وہ آیندہ دیکھا جاویگا لیکن اس بات میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ اسوقت تک سائنس کی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو معقول طور پر ہستی باریتعالیٰ کے خلاف پیش کی جاسکے اور حق یہی ہے اور یہی رہے گا کہ یہ دُنیا مع اپنی بے شمار مختلف الصورت عجیب و غریب چیزوں کے اور مع اپنے اس نہایت درجہ حکیمانہ قانون کے جو اسکی ہر چیز میں الگ الگ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور مع اپنے اس حیرت انگیز نظام کے جس نے اسکی بے شمار مختلف الخواص چیزوں کو ایک واحد لڑی میں پرو رکھا ہے اور جسکی وجہ سے دنیا کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ضروریات کے مہیا کرنے کیلئے لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلہ پر بے شمار قدرتی کارخانے دن رات کام میں لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات کا ایک زبردست ثبوت ہے کہ اس دنیا کے اوپر ایک حکیم و علیم قدیر و مہیمن ہستی کام کر رہی ہے جسکے قبضۂ تصرف سے کوئی چیز باہر نہیں +

مسئلہ ارتقا کیوں ٹھوکر کا موجب بن رہا ہے

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل میں یہ بات بھی مختصر طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ وجہ کیا ہے کہ جبکہ مسئلہ ارتقا قطع نظر اسکے کہ وہ صحیح ہے یا غلط یا کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط۔ خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق حقیقتاً اعتراض کا موجب نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت سے لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب بن رہا ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ مسئلہ

ارتقا نے دو وجہ سے لوگوں کو غلطی میں ڈالا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حامیانِ مسئلہ ارتقاء نے جب یہ خیال پیدا کیا کہ مادہ خود اپنی ذات کے اندر یہ خاصیت رکھتا ہے کہ وہ مختلف صورتیں اختیار کرے اور ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کیطرف ترقی کرتا چلا جاوے۔ اور موجودہ دنیا کی سب چیزیں اور خصوصاً انسان اسی قانون ارتقاکی صنعت کا کرشمہ ہیں تو بوجہ اسکے کہ انکو روحانی طور پر ذات باریتعالیٰ کے متعلق کوئی بصیرت حاصل نہیں تھی انکے دل میں یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ شاید دُنیا کے اوپر کوئی الگ خدا نہ ہو بلکہ یہ دُنیا اپنے آپ سے ہی ہو۔ اور مادہ کے اندرونی خواص کے نتیجے میں ہی یہ سارا کارخانہ چلتا چلا جارہا ہو۔ چنانچہ بالآخر وہ اسی خیال پر قائم ہو گئے کہ دُنیا ایک مشین کے طور پر چل رہی ہے اور دُنیا کے یہ سارے تغیرات اور نظائر اسی اندرونی میکینزم (Mechanism) یعنی اندرونی صنعت کا نتیجہ ہیں۔ اس شبہ کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو جس رنگ کا قانون صنعت دُنیا میں پایا جاتا ہے وہ خود اس بات کو چاہتا ہے کہ دُنیا کے اوپر ایک الگ بالا ہستی کے وجود کو مانا جاوے۔ جس نے اس نہایت حکیمانہ قانون کو مادہ میں ودیعت کر رکھا ہے اور پھر مادہ اپنے حالات کوائف سے بھی ایک خالق و مالک ہستی کو چاہتا ہے اور پھر یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ دُنیا میں صرف میکینزم (Mechanism) ہی نہیں ہے بلکہ نیچر کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ دنیا میں ایک خاص ترتیب یعنی Design اور ایک علت غائی یعنی Teleology بھی پائی جاتی ہے اور یہ سب باتیں ایک مستقل مدرک بالارادہ خالق و مالک ہستی کیطرف اشارہ کررہی ہیں چنانچہ آگے چل کر اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاوے گا۔ دوسری بات جسکی وجہ سے مسئلہ ارتقاء بعض لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب بن گیا ہے یہ ہے کہ مسئلہ ارتقاء Evolution Theory نے خلق عالم اور خصوصاً خلق انسان کو ایک ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جو اس زمانہ کے معروف الہامی مذاہب کی عرفی تعلیم کے خلاف نظر آتا ہے اور یہ طبعی امر ہے کہ جب الہامی مذہب کے اوپر کوئی ایسا حملہ ہو جو اسکی صحت کو مشتبہ کردے اور انسان اسکے جواب اور حل کی طاقت نہ رکھتا ہو تو طبعاً وہ خدا کی ہستی کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جب وہ بات بھی جو خدا کیطرف

منسوب کی جاتی تھی غلط نکلی تو یہ سب کارخانہ مذہب کا باطل ہے اور خدا بھی ایک خیال موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ بعینہٖ یہی صورت مسئلہ ارتقا کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کو پیش آئی ہے مسیحی لوگ اپنے پادریوں سے اور مسلمان اپنے مولویوں سے اور دوسرے لوگ اپنے دینی علماء سے یہ سنتے تھے کہ پہلے سب دھوآں یا پانی تھا اور اس سے خدا نے یہ گوناگوں چیزیں پیدا کیں۔ اور خدا نے یہ زمین اور آسمان اور انکے درمیان کی چیزیں چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں پیدا کیں اور پھر اس نے ایک مٹی کا بُت بنا کر اسکے اندر پھونک ماری تو باوا آدم پیدا ہو گئے اور پھر انکی پسلی سے اماں حوا نکل آئیں اور پھر ان دونوں کی نسل آگے چلنی شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ انسانی نسل کا سات ہزار سال سے جاری ہے اور پھر بعض کے نزدیک یہ کہ ابتداءً خدا کے ماتحت مادہ نے ایک انڈے کی صورت اختیار کی اور یہ انڈا پھٹ کر دو حصوں میں ہو گیا جس سے ایک طرف زمین بن گئی اور دوسری طرف آسمان بن گیا۔ اور یہ کہ مرد و عورت خدا کے وجود سے نکل کر ظاہر ہو گئے یا یہ کہ خدا کو پسینہ آیا۔ اور پسینے کے قطروں سے یہ سارا عالم پیدا ہو گیا وغیر ذالک۔ اس قسم کی باتیں پیدائش عالم کے متعلق لوگ اپنے پادریوں اور مولویوں اور پنڈتوں وغیرہ سے سُن رہے تھے کہ اچانک انکے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ سائنس کی تحقیقات سے یہ سارے قصے جھوٹے ثابت ہو گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ سارا عجائب خانہ عالم مادہ کے خواص ارتقائی سے ظہور میں آیا ہے اور لاکھوں اور کروڑوں سال کے عرصہ میں ہر ایک چیز ادنیٰ حالت سے ترقی کر کر کے اعلیٰ حالت کو پہنچی ہے اور انسان بھی اسی ارتقا کا کرشمہ ہے وغیر ذالک۔ بس پھر کیا تھا لوگ مذہب کیطرف سے بدظن ہو گئے۔

اور سائنس کی نئی روشنی نے انکی مذہبی آنکھوں کو خیرہ کرنا شروع کر دیا اور وہ ایسے بدحواس ہو کر بھاگے کہ خدا کا عقیدہ بھی اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ مذہب کی اس شرمناک ہزیمت کی سب سے زیادہ ذمہ واری مغربیہ کے مسیحی پادریوں پر ہے کیونکہ مسئلہ ارتقا کی آواز سب سے پہلے انکے کانوں میں پہنچی اور انہوں نے اس آواز سے بدحواس ہو کر ایسی ایسی مذبوحی حرکات کیں کہ دیکھنے والوں پر انکی مذبوحیت آشکارا ہو گئی اور ہزاروں لاکھوں انسانوں نے پادریوں کی اس حالت کو دیکھ کر اور اپنے آپ کو بھی بے بس پا کر

دہریت کا راستہ اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہی آواز کسی دوسری قوم تک پہنچی تو اس احساس سے کہ ایک مذہبی دستہ پہلے اس حملہ کے سامنے پسپا ہو چکا ہے ان میں سے بھی بعض لوگوں نے ہمت ہار دی اور اس طرح ہر پہلی شکست بعد کی شکست کیلئے راستہ صاف کرتی گئی۔ حالانکہ اگر لوگ ذرا غور و فکر سے کام لیتے تو بات نہایت معمولی تھی۔ کیونکہ اوّل تو بہت سے خیالات جو اس وقت مختلف مذاہب عالم کے متبعین میں خلق عالم اور خلق آدم کے متعلق پائے جاتے ہیں وہ دراصل بعد کے علماء کے اپنے حواشی ہیں اور ان مذاہب کی اصل الہامی کتب یا دیگر مستند کتب میں ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انکے غلط ثابت ہونے سے ہرگز کوئی اعتراض مذہب پر وارد نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ پیدائش عالم کے متعلق بعض خیالات ایسے بھی ہیں جو بعد کی دست برد سے یا بعض صورتوں میں غیر زبانوں میں تراجم کی غلطی کی وجہ سے مذہبی کتب کا حصہ بن گئے ہیں مگر درحقیقت اصل الہامی کتب میں وہ پائے نہیں جاتے تھے۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صورت میں بھی مذہب کی تعلیم پر حقیقتاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اور تیسرے یہ کہ ان خیالات میں سے بعض واقعی اصل الہامی کتب میں پائے جاتے ہیں مگر ان کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے خطرناک غلطی کھائی ہے اور اس وجہ سے حامیان مسئلہ ارتقا کو اعتراض کا موقعہ مل گیا ہے۔ مثلاً قرآن شریف میں یہ واقعی بیان ہوا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو چھ ایام میں پیدا کیا ہے لیکن بعض لوگوں نے اسکے معنے کرنے میں یہ غلطی کھائی ہے کہ ایام سے یہ چوبیس گھنٹے والے دن مراد لے لئے ہیں۔ حالانکہ یوم کا لفظ عربی زبان میں جہاں دن کے معنوں میں آتا ہے وہاں بہت دفعہ اسکے معنے صرف وقت اور زمانے کے بھی ہوتے ہیں اور جاہلیت کے عرب شعرا میں کثرت کے ساتھ یوم کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن بعض لوگوں نے سادگی یا کم علمی سے اسکے معنے چھ دن کر دیئے اور پھر آگے سمجھنے والوں نے دن سے چوبیس گھنٹے مراد لے لئے۔ حالانکہ خود آیت کا قرینہ اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں عام عرفی دن مراد نہیں ہے کیونکہ یہ عرفی دن تو سورج کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور زمین کے چکر کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے اور جس زمانہ کا اس آیت میں ذکر ہے وہ سورج

اور زمین کے وجود سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ ہم نے زمین و آسمان اور سورج اور چاند اور ستاروں کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے پس لامحالہ یہاں دن سے مُراد وہی دن لیا جاویگا جو اِن شمسی دنوں سے پہلے موجود تھا۔ اور وہ عام زمانہ اور وقت ہے پس نہ صرف لغت عرب بلکہ خود آیت کا قرینہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں یوم سے مراد عام عرفی دن نہیں بلکہ زمانہ اور وقت ہے اور اس طرح آیت قرآنیہ کے یہ معنی ہوئے۔ کہ ہم نے موجودہ دنیا کو چھ مختلف اوقات میں درجہ بدرجہ پیدا کیا ہے اور یہ وہ دعویٰ ہے جسکے متعلق سائنس کی رو سے کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ بلکہ خود سائنس دان اس بات کو مانتے ہیں کہ یہ عالم آہستہ آہستہ مختلف درجوں اور دوروں میں سے گذر کر موجودہ حالت کو پہنچا ہے۔ اسی طرح مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ دُنیا کی عمر سات ہزار سال کی ہے اور یہ کہ آدم کو آنحضرت صلعم سے پانچہزار سال پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ اور اسکے معنی بعض لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لئے ہیں کہ گویا نسل انسانی کا آغاز صرف چند ہزار سال سے ہوا ہے اور اس طرح مسئلہ ارتقا والوں کو اعتراض کا بہت اچھا موقع مل گیا ہے حالانکہ حق یہ ہے کہ اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ یہ کارخانہ عالم صرف چند ہزار سال سے جاری ہے اور اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ اور اسلام کیطرف اس خیال کو منسوب کرنا سراسر جہالت اور نادانی ہے۔ اسلام کا تو یہ عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی صفت بھی کسی زمانہ میں مستقل طور پر معطل نہیں ہوتی۔ اور ہر زمانہ میں اسکی ہر صفت ظاہر ہوتی رہتی ہے پس چونکہ خلق بھی اسکی صفات میں سے ایک صفت ہے لہذا یہ عقیدہ سراسر اسلام کے خلاف ہوگا۔ اگر یہ سمجھا جاوے کہ گویا صرف پانچ یا چھ یا سات ہزار سال سے ہی مخلوقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے لہذا احدیث مذکورہ بالا کے یہ معنی نہیں ہوسکتے۔ کہ دُنیا کی عمر صرف چند ہزار سال کی ہے بلکہ جیسا کہ خود اکابر علماء اسلام نے لکھا ہے۔ اور اس زمانہ کے مصلح حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے مفصل تشریح فرمائی ہے اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ دُنیا پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور موجودہ نسل کا دور چند ہزار سال سے شروع ہے اور نہ معلوم ایسے کتنے دَور اس دُنیا پر آئے ہیں۔ چنانچہ اسلام کے ایک بڑے بزرگ صوفی محی الدین صاحب ابن عربی لکھتے ہیں کہ مجھے عالم کشف میں دکھایا گیا ہے کہ اس دنیا میں لاکھوں

آدم گذرے ہیں۔ اور جب ایک آدم کی نسل کا دَور ختم ہوتا ہے۔ تو دوسرے آدم کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس بات کا علم خدا کے پاس ہے کہ دنیا پر کتنے دَور آئے ہیں۔ پس اس معنی کے لحاظ سے قطعاً کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ اور یہی معنے درست و حق ہیں اور یہ خیال اسلام کی رو سے سراسر باطل ہے کہ آج سے چند ہزار سال قبل کوئی مخلوق نہیں تھی۔ اور گویا خدا نعوذ باللہ معطل بیٹھا تھا۔ اسی طرح مثلاً قرآن شریف میں آتا ہے کہ ہم نے آدم کو مٹی سے بنا کر پھر اپنے حکم سے اسکے اندر جان ڈالی۔ اور اس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گویا نسل انسانی کا آغاز اس طرح پر ہوا ہے کہ خدا نے ایک مٹی کا آدم بنایا۔ اور پھر اس میں پھونک مار کر جان ڈالدی۔ اور اسکے بعد نسل انسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ آیت قرآنی کا صرف اتنا مطلب ہے کہ آدم کی خلقت میں اجزائے ارضی کا خمیر ہے جسکی وجہ سے وہ مادیات کیطرف مائل ہو جاتا ہے اور اسی لئے خدا نے اسکی بناوٹ میں روحانی عنصر کا چھینٹا دے دیا ہے تاکہ اسکے مادی عناصر اسکی روحانی ترقی میں روک نہ ہو جائیں۔ گویا ایک نہایت لطیف مضمون کو جسے قرآن شریف نے حسب عادت استعارہ میں ادا کیا تھا۔ مادی معنوں میں لیا جا کر جائے اعتراض بنا لیا گیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر اس آیت کے ظاہری معنے لئے جاویں تو پھر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ قرآن شریف پیدائش عالم کی ماہیت بیان کرنیکے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ اس کا کام دُنیا کی اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے اور اس نے دوسرے مضامین کا صرف اس حد تک ذکر کیا ہے جس حد تک کہ اسکی اس غرض کے لئے ضروری تھا۔ اور باقی باتوں کو چھوڑ دیا ہے مثلاً قوانین طب کا بیان کرنا قرآن شریف کا کام نہیں کیونکہ قرآن شریف طب کی کتاب نہیں ہے لیکن چونکہ انسان کی صحت عامہ کا اسکے اخلاق اور دین پر اثر پڑتا ہے اس لئے کہیں کہیں ضروری سمجھ کر شریعت اسلامی نے ایسی اصولی باتوں کی طرف بھی توجہ دلا دی ہے جو حفظان صحت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں لیکن صرف اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھا ہے جہاں تک کہ اسکی اپنی غرض و غایت کے ماتحت ضروری تھا۔ اس اصول کے ماتحت اگر مذکورہ بالا قرآنی آیت کے معنی کئے جائیں تو کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ خدا نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور اسکے اندر اپنے حکم سے جان ڈالی جس کا

صرف یہ مطلب ہے کہ انسان کا جسم اور اسکی رُوح خدا کی مخلوق ہیں اور انسان کو خدا کیطرف جھکنا چاہیئے لیکن اس بات کے متعلق قرآن شریف خاموش ہے کہ مٹی سے کونسی مٹی مراد ہے۔ کیونکہ سارے کیمیاوی سالٹ مٹی ہی کا حصہ ہیں اور پھر اس بات کے متعلق بھی خاموش ہے کہ مٹی سے کس طرح بنایا کتنے عرصہ میں بنایا۔ کتنے درجوں اور کس قسم کے درجوں میں گذار کر موجودہ حالت کو پہنچایا وغیر ذالک۔ اسی طرح خدا نے اسکے اندر جان ڈالی تو کہاں سے ڈالی کس طرح ڈالی۔ کتنے درجوں اور کس قسم کے درجوں میں ڈالی۔ اور اس کا نشوونما کیسے کیا وغیر ذالک۔ ان سوالات کو چھوٹا قرآن شریف نے اپنی غرض وغایت سے لاتعلق سمجھا۔ اس لئے خاموشی اختیار رکی۔ پس کوئی سائنس دان قرآن شریف کے بیان پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں خلق انسان کی ایک ایسی اجمالی کیفیت بیان کی گئی ہے جو سائنس کی کسی ثابت شدہ حقیقت کے خلاف نہیں۔ اور اگر کوئی شخص قرآن شریف کے اس بیان پر اپنی طرف سے حاشیے چڑھا کر پھر اسے سائنس کے کسی مسئلہ کے مقابل پر لاتا ہے تو اس کا ذمہ وار وہ خود ہے اسلام پر اسکی وجہ سے کوئی حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ حوّا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسکے یہ معنی سمجھے ہیں کہ آدمی کے جسم کو پھاڑ کر اسکی پسلی کی ہڈی سے حوّا کا وجود پیدا کیا گیا ہے اور اس طرح مسئلہ ارتقا والوں کو اعتراض جمانے کا موقعہ مل گیا ہے حالانکہ جیسا کہ الہامی کتب کا عام طریق ہے یہ الفاظ استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور اس حدیث کے معنے یہ ہیں کہ عورت مرد کے پہلو بہ پہلو رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور وہ مرد کی رفیق حیات ہے لیکن مرد کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جس طرح پسلی کی ہڈی ٹیڑھی ہوتی ہے عورت میں بعض مصالح کے ماتحت فطری کمزوریاں رکھی گئی ہیں۔ اور مرد کو اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسکی فطری کمزوریوں کا خیال رکھتے ہوئے ملاطفت اور عفو کا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ دوسری جگہ حدیث میں آنحضرت صلعم نے عورت کے متعلق یہی الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ عورت ایک ٹیڑھی پسلی کیطرح ہے پس مردوں کو چاہیئے کہ اسکی اس کجی کا خیال رکھیں اور اس کو اس قدر سیدھا کرنے کی کوشش نہ کریں کہ وہ ٹوٹ ہی جاوے۔ الغرض قرآن شریف یا صحیح احادیث میں جو پیدائش عالم یا پیدائش آدم کے متعلق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ انکے متعلق ہرگز کسی قسم کا

اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے یا انکو قابل اعتراض سمجھا ہے وہ ان لوگوں کی ناواقفیت اور کم علمی ہے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دوسری الہامی کتب کی جو تعلیمات قابل اعتراض سمجھی گئی ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور ان کے صحیح معنوں کو سمجھا نہیں گیا۔ اور اگر کسی جگہ کوئی حقیقی اعتراض پیدا بھی ہوتا ہے تو وہ یقیناً بعد کی دست برد کا نتیجہ ہے جس سے بدقسمتی سے سوائے قرآن شریف کے کوئی الہامی کتاب نہیں بچی۔ ہاں چونکہ خدا کے فضل سے قرآن شریف ہر طرح محفوظ ہے اور سخت سے سخت مخالف بھی اسکے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ وہ تحریف سے بالکل پاک رہا ہے۔ اس لئے ہم قرآن شریف کے متعلق یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسکی کوئی بات ایسی نہیں کہ جس پر کوئی معقول اعتراض ہو سکتا ہو۔ اور سائنس کی کوئی صداقت قرآن شریف کی کسی تعلیم کے خلاف نہیں۔ اور ایسا ہونا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ قرآن شریف خدا کا قول۔ اور نیچر جسکی مفسر سائنس ہے خدا کا فعل ہے۔ اور خدا کا قول اور فعل آپس میں ٹکرا نہیں سکتے +

اس بحث کے ختم کرنے سے قبل میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسئلہ ارتقا ابھی تک ایک قیاس یعنی تھیوری کی حد تک ہے اور سائنس کے ثابت شدہ حقائق میں داخل نہیں ہوا اور اس لئے اس کو ہرگز وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ثابت شدہ حقائق کو حاصل ہے اور اس مسئلہ کی بعض جزئیات تو ابھی تک ایک مقبولِ عام تھیوری کی حد کو بھی نہیں پہنچیں۔ اور انکے متعلق خود سائنس دانوں میں کثیر اختلاف پایا جاتا ہے۔ پس محض اس مسئلہ کی وجہ سے خدا کی ذات کے متعلق اعتراض کرنا کوئی دانائی کا رستہ نہیں +

خدا غیر مخلوق ہے

اگلی دلیل کا بیان شروع کرنے سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے جو اس موقعہ پر بعض ناواقف لوگوں خصوصاً نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا ہے یعنی جب دُنیا کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا خالق و مالک کون ہے تو خدا کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہونا چاہیئے کہ خدا کا خالق و مالک کون ہے؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قطع نظر اسکے کہ خدا کے متعلق ایسا سوال پیدا ہی نہیں

ہو سکتا جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا جاوے گا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جاوے کہ جو ہستی اس دُنیا کی خالق و مالک ہے اسے کسی اور بالا ہستی نے پیدا کیا ہے تو پھر بھی دلیل کی رو سے کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اس صورت میں ہم اس بالا ہستی کا نام خدا رکھیں گے۔ اور اس ماتحت ہستی کو مخلوقات میں سے ایک مخلوق اور سلسلہ اسباب میں سے ایک سبب اور وسائط خلق میں سے ایک واسطہ قرار دینگے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ پھر اس بالا ہستی کا خالق و مالک کون ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اگر یہ بالا ہستی بھی کسی بالا در بالا ہستی کی مخلوق ہے تو پھر یہ بالا در بالا ہستی ہی خدا کہلائیگی اور اسکے نیچے کی تمام ہستیاں مخلوقات کا حصہ سمجھی جاوینگی۔ الغرض جس ہستی پر بھی اس سلسلہ کو بند قرار دیا جاوے یعنی جس ہستی کو بھی اس سلسلہ کی ابتدائی ہستی سمجھا جاوے جسکے اوپر کوئی اور ہستی نہیں ہے اسی کا نام ہم خدا رکھتے ہیں اور اسکے سوا باقی سب کو مخلوقات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور اگر کسی شخص کو یہ خیال گذرے کہ چونکہ ہر ہستی کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا جاویگا کہ اس کا خالق و مالک کون ہے اس لئے کوئی ایسی ہستی ثابت ہی نہ ہو سکے گی جسے ابتدائی ہستی کہا جا سکے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ اس سلسلہ کی کوئی ابتدائی ہستی نہ ہو کیونکہ اگر کوئی ابتدائی ہستی تسلیم نہ کی جاوے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیچے کی تمام ہستیوں کے وجود سے جو ابتدائی ہستی کا نتیجہ ہیں۔ اور جن میں سے ایک دُنیا بھی ہے انکار کرنا پڑتا ہے جسکے دوسرے الفاظ میں یہ معنے ہیں کہ یہ دنیا و مافیہا صرف وہم ہی وہم ہے ورنہ در اصل نہ کوئی زمین ہے اور نہ کوئی آسمان ہے اور نہ کوئی چاند ہے اور نہ کوئی سورج ہے اور نہ کوئی ستارے ہیں اور نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی حیوان ہے اور نہ کوئی درخت ہے اور نہ کوئی پانی ہے اور نہ کوئی ہوا ہے اور نہ کوئی اور چیز ہے۔ مثلاً اگر ہم اس دُنیا کو اَلف قرار دیں اور اسکے خالق کا نام بَ رکھیں اور یہ فرض کریں۔ کہ بَ کو جؔ نے پیدا کیا اور جؔ کو دؔ نے۔ اور اسی طرح جہانتک ہماری طاقت ہے اس سلسلہ کو اوپر لے جاتے چلے جائیں۔ یعنی ہر ہستی کے متعلق یہ فرض کرتے جاویں کہ وہ کسی دوسری بالا ہستی کی مخلوق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ کسی جگہ بھی ختم نہیں ہوگا۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ اس سلسلہ کی کوئی ایسی کڑی ثابت نہیں ہو سکے گی جسے ہم ابتدائی

کڑی کہہ سکیں۔ اور جب ابتدائی کڑی ثابت نہ ہوئی۔ تو لامحالا اس سے نیچے والی کڑی بھی جو اس ابتدائی کڑی کی مخلوق ہے ثابت نہ ہوگی۔ اور جب یہ نیچے والی کڑی ثابت نہ ہوئی تو اس نیچے والی کڑی سے نیچے کی کڑی بھی ثابت نہ ہوگی۔ الغرض صرف ابتدائی کڑی کے ثابت نہ ہوسکنے کی وجہ سے نیچے کی تمام کڑیاں باطل چلی جاتی ہیں۔ گویا اوپر والی مثال لیکر کہہ سکتے ہیں کہ اگر د کا وجود ثابت نہیں ہے تو لامحالا ج بھی نہیں ہے اور اگر ج نہیں ہے تو ب بھی نہیں اور اگر ب نہیں تو الف بھی نہیں۔ گویا د کے وجود کے انکار سے الف کا انکار لازم آتا ہے حالانکہ کم از کم (الف کا وجود (جو ہم نے اس دُنیا کا نام رکھا ہے) مسلمہ طور پر ثابت ہے کیونکہ دُنیا کے موجود ہونیسے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ پس ثابت ہؤا کہ ایسا طریق استدلال جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ اس سلسلہ کی کوئی ابتدائی کڑی ثابت نہ ہوسکے غلط ہے کیونکہ اس سے دُنیا کے موجود ہونے سے انکار کرنا پڑتا ہے لہذا ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلہ کی کوئی ابتدائی کڑی قرار دیں جسکے یہ معنی ہیں کہ کسی ایسی ہستی پر ایمان لائیں جسکے اوپر کوئی اور ہستی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی ہستی وہی ہوسکتی ہے جو غیر مخلوق ہو اور اسی کا نام ہم خدا رکھتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس سلسلہ کو خواہ کتنا بھی لمبا کھینچا جاوے کسی نہ کسی جگہ اسے بند قرار دینا ہوگا یعنی کسی نہ کسی ہستی سے اس سلسلہ کی ابتدا تسلیم کرنی پڑیگی۔ اور یہی ابتدائی ہستی خدا ہے جو غیر مخلوق ہے اور اس کے ماتحت جتنی بھی ہستیاں ہیں خواہ وہ ایک دوسرے سے اپنے طبعی قویٰ اور فطری طاقتوں میں کیسی ہی اعلیٰ اور اشرف ہوں سب کی سب بلا استثناء مخلوقات کا حصہ اور خدائے واحد کے قبضۂ تصرف کے نیچے ہیں۔ وھو المراد ۔

اس کے بعد میں مختصر طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دراصل یہ سوال ہی غلط ہے کہ خدا کا خالق و مالک کون ہے کیونکہ خدا کے متعلق ایسا سوال قطعاً پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ خدائیت اور مخلوقیت کا مفہوم ایک دوسرے کے منافی واقع ہوئے ہیں اور یہ عقلاً ناممکن ہے کہ یہ دونو مفہوم ایک وجود میں جمع ہوں۔ کیونکہ جہاں خدائیت کا مفہوم اس بات کا تقاضا کررہا ہے کہ صرف اس ہستی کا نام خدا رکھا جائے جو سب سے بالا ہے وہاں مخلوقیت کا مفہوم اس بات کا متقاضی ہے کہ جس ہستی کو ہم مخلوق قرار دیں اس کے اوپر کوئی اور ہستی بھی ہو پس

یہ دونو مفہوم کسی صورت میں بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ خوب سوچ لو کہ کسی ہستی کو مخلوق قرار دینے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس ہستی کے اوپر ایک اور بالا ہستی کے وجود کو تسلیم کریں جو اسکی خالق و مالک ہے۔ پس اگر خدا کو مخلوق سمجھا جاوے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ خدا کے اوپر بھی ایک اور ہستی موجود ہے جو خدا کی خالق ہے خدا کی مالک ہے خدا پر حکمران ہے اور جسکے سہارے پر خدا کی ذات قائم ہے۔ غرض جو ہر طرح اور ہر جہت سے خدا سے بالا اور فائق ہے۔ اب غور کرو کہ اگر واقعی کوئی ایسی بالا ہستی موجود ہے تو پھر وہی بالا ہستی خدا ہوئی نہ کہ یہ نام نہاد ماتحت خدا۔ جو کہ مخلوق بھی ہے اور مملوک بھی ہے اور محکوم بھی ہے۔ کون عقلمند ہے کہ جو اس بالا ہستی کے موجود ہوتے ہوئے اس ماتحت ہستی کے متعلق خدا کا لفظ استعمال کر سکتا ہے؟ خوب سوچ لو کہ تم صرف اس وقت تک کسی ہستی کا نام خدا رکھ سکتے ہو جب تک کہ تم اسے غیر مخلوق سمجھتے ہو اور جونہی کہ تم اس کے متعلق مخلوق ہونے کا سوال پیدا کرو تم مجبور ہو جاتے ہو کہ اس کے اوپر ایک بالا ہستی کے وجود کو تسلیم کرو جو اسکی خالق و مالک ہے اور اس بالا ہستی کو تسلیم کرتے ہی خدایت کا مفہوم اس ماتحت ہستی سے خارج ہو کر فوراً اس بالا ہستی کیطرف منتقل ہو جاتا ہے۔ الغرض جس ہستی کو بھی مخلوق قرار دیا جاوے وہ خدا نہیں رہ سکتی کیونکہ اس صورت میں خدا اس ہستی کا نام رکھا جائے گا جو اسکی خالق اور اس پر فائق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خدایت اور مخلوقیت کے مفہوم کبھی بھی ایک وجود میں جمع نہیں ہو سکتے یعنی یہ ناممکن ہے کہ ایک ہستی خدا بھی ہو اور مخلوق بھی۔ اور جب یہ ناممکن ہوا تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب ہم کسی ہستی کو خدا مان لیں تو پھر اسکے متعلق یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا خالق کون ہے؟

تیسرا جواب جو میں اس شبہ کا دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قطع نظر اس بات کے کہ خدا کے متعلق یہ سوال اٹھایا ہی نہیں جا سکتا کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے۔ آؤ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ خدا مخلوق ہے اور پھر دیکھتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر اک چیز اپنے اندر بعض مخصوص صفات اور خواص رکھتی ہے اور انہی خواص اور صفات کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں سے ممتاز نظر آتی ہے۔ مثلاً پانی اپنے اندر ایسے خواص رکھتا ہے جو ہوا اور پتھر میں نہیں پائے جاتے اور انہی خواص کی وجہ سے ہم ہوا اور پتھر سے پانی کا

امتیاز کرتے ہیں۔ اگر ان خواص کو پانی سے الگ کر لیا جاوے تو پھر پانی پانی نہیں رہ سکتا۔ خلاصہ
کلام یہ کہ ہراک چیز اپنے اندر بعض مخصوص صفات اور خواص رکھتی ہے اور یہی خواص وصفات
ہیں جو اُسکی ہستی کو قایم رکھنے والے اور دوسری چیزوں سے اسکے امتیاز کا موجب ہوتے ہیں
اب جب ہم ایک ہستی کے متعلق خدا کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری عقل اسکے لئے بعض ایسے
صفات تجویز کرتی ہے کہ جنکی وجہ سے وہ خدا کا نام پانے کا حقدار ہوتا۔ اور دوسری چیزوں
سے الگ ممتاز نظر آتا ہے۔ گویا یہ صفات خدایت کے لئے بطور ستون کے ہیں جنکو اگر اس سے
الگ کر لیا جاوے تو پھر وہ خدا نہیں رہ سکتا۔ مثلاً عقل ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ
قدیم ہونا چاہیئے یعنی وہ ہمیشہ سے موجود ہونا چاہیئے۔ عقل ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کوئی خدا
ہے تو وہ غیر فانی ہونا چاہیئے یعنی وہ ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ عقل ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کوئی
خدا ہے تو وہ قایم بالذات ہونا چاہیئے یعنی وہ بغیر کسی دوسری ہستی کے سہارے کے خود اپنی ذات
میں قایم ہونا چاہیئے عقل ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ قادر مطلق ہونا چاہیئے یعنی اسکی
قدرت کامل ہونی چاہیئے۔ اور اس کے کاموں میں کسی کو دخل انداز ہونیکی طاقت نہ ہونی چاہیئے
عقل ہمیں بتاتی ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ احد ہونا چاہیئے یعنی وہ واحد و یکتا ہونا چاہیئے اور
اس کے مقابل میں کوئی ایسی ہستی موجود نہ ہونی چاہیئے جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ عقل ہمیں
بتاتی ہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ اپنی تمام صفات میں مستقل اور آزاد ہونا چاہیئے یعنی اس کی تمام
صفات اس کے اندر بالاستقلال پائی جانی چاہئیں اور ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کی صفات
کا قیام کسی دوسری ہستی کی مرضی پر موقوف ہو۔ یہ چند صفات جو مینے بطور مثال کے بیان کی ہیں ایسی
صفات ہیں جو عقل کی رو سے اس ہستی میں پائی جانی ضروری ہیں جس کا نام ہم خدا رکھتے ہیں۔ کیونکہ
نظامِ عالم کا قیام جس طرح کہ وہ چلتا چلا آیا ہے اور چل رہا ہے بغیر ان صفات کے محال ہے گویا یہ
صفات اور اسی قسم کی دوسری صفات عرشِ اُلوہیت کے لئے بطور ستون کے ہیں جن کے بغیر یہ
عرش کسی صورت میں قایم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر خدا کو مخلوق مانیں۔ تو اس کی ان تمام
صفات سے انکار کرنا پڑتا ہے اور ان صفات میں سے کوئی ایک بھی نہیں جو خدا کو مخلوق مانکر اس میں
قایم رہ سکے۔ مثلاً یہ ظاہر ہے کہ اگر خدا مخلوق ہے تو وہ قدیم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسے حادث ماننا پڑیگا

اگر خدا مخلوق ہے تو وہ غیر فانی نہیں رہ سکتا بلکہ اسے فانی ماننا پڑے گا۔ اگر خدا مخلوق ہے تو وہ قائم بالذات نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اسے اس ہستی کے سہارے پر قائم ماننا پڑے گا۔ جو اسکی خالق و مالک ہے اگر خدا مخلوق ہے تو وہ قادر المطلق نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اسکی قدرتوں کو محدود ماننا پڑے گا۔ اور نیز اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ہستی جو اسکی خالق و مالک ہے وہ جب اور جس طرح چاہے اسکے کاموں میں دخل انداز ہوسکتی ہے۔ اگر خدا مخلوق ہے تو وہ احد نہیں مانا جاسکتا بلکہ اس بات کا امکان ماننا پڑے گا کہ اسکے علاوہ اور بھی بہت سے خدا ہیں۔ کیونکہ جو ہستی ایک خدا پیدا کرسکتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس نے اپنی صفت خلق اور اقتدار و حکومت کی وسعت ثابت کرنے کیلئے بہت سے خدا نہ پیدا کئے ہوں۔ اگر خدا مخلوق ہے تو وہ اپنی کسی صفت میں بھی مستقل اور آزاد نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ اسکی ہر صفت اس بالا ہستی کی مرضی اور رحم پر موقوف ماننی جاویگی جس نے خدا کو پیدا کیا ہے کیونکہ مخلوق کی ہر صفت بھی مخلوق ہوتی اور خالق کے قبضہ تصرف کے نیچے ماننی پڑتی ہے۔ الغرض خدا کو مخلوق ماننے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ خدا کی تمام وہ صفات جنپر عقل کی رو سے عرش اُلوہیت کا قیام تسلیم کرنا پڑتا ہے باطل چلی جاتی ہیں اور خدا اپنی خدائیت کے تخت سے معزول ہو کر ان معمولی مخلوق ہستیوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے جو اپنی ہر بات میں اپنے خالق و مالک کا سہارا ڈھونڈتی ہیں اور قطعاً کوئی آزادانہ زندگی نہیں رکھتیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ خواہ کسی جہت سے بھی دیکھا جاوے خدائیت اور مخلوقیت کا مفہوم ایسی طرح ایک دوسرے کے مقابل اور ضد میں واقع ہوا ہے کہ کسی طرح بھی ایک وجود میں جمع نہیں ہوسکتا۔ پس ہم مجبور ہیں کہ جس ہستی کو ہم خدا قرار دیں اسے غیر مخلوق سمجھیں اور جسے مخلوق سمجھیں اس کا نام خدا نہ رکھیں۔ وھو المراد +

کیوں نہ اس دُنیا کو ہی غیر مخلوق سمجھ لیا جاوے

اس کے بعد میں ایک اور شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اکثر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوسکتا ہے اور جو یورپ کے دہریوں کیطرف سے عموماً پیش کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم نے خدا کو غیر مخلوق قرار دیکر اسے خود بخود ہمیشہ سے بغیر کسی خالق و مالک کے ماننا ہے تو کیوں نہ اس دُنیا کو ہی قائم بالذات اور غیر مخلوق قرار دے لیا جاوے تاکہ اس ساری

بحث کا یہیں نیچے ہی خاتمہ ہو جاوے۔ یہ وہ شبہ ہے جو اس جگہ پیدا ہو سکتا ہے اور جو واقعی بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہؤا کرتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شبہ سراسر قلت تدبر پر مبنی اور محض عامیانہ تخیل کا نتیجہ ہے اور اس سے زیادہ اسکی کچھ حقیقت نہیں۔ دراصل اس شبہ کی بنا اس خیال پر ہے کہ چونکہ خدا کو غیر مخلوق مانا جاتا ہے اس لئے ثابت ہؤا کہ کسی چیز کا خود بخود اپنے آپ سے بغیر کسی خالق کے ہونا بھی ممکن ہے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس دنیا کو مخلوق قرار دیکر اسکے اوپر کسی خدا کے وجود پر ایمان لائیں بلکہ ہم اس دنیا کو ہی غیر مخلوق اور قائم بالذات قرار دے لیتے ہیں۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ہم نے جو دُنیا کو مخلوق مانا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ چونکہ ہر چیز کا مخلوق ہونا ضروری ہے اس لئے دنیا بھی مخلوق ہونی چاہیئے بلکہ اس لئے کہ دُنیا کے حالات اسے مخلوق ثابت کر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ اصول قائم کرتے کہ بلا استثناء ہر اک چیز کا مخلوق ہونا ضروری ہے خواہ اسکے حالات کیسے ہی ہوں تو پھر بے شک یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ یا تو خدا کو بھی مخلوق مانا جاوے اور یا پھر اس اصول کو رد کر کے دُنیا کے غیر مخلوق ہونیکے امکان کو تسلیم کیا جاوے۔ پس یہ اعتراض غلط ہے کہ چونکہ خدا کو غیر مخلوق ماننا پڑتا ہے اس لئے کوئی حرج نہیں اگر دنیا کو ہی غیر مخلوق سمجھ لیا جاوے۔ ہر اک چیز اپنے اپنے مخصوص حالات رکھتی ہے اور انہی مخصوص حالات کے ماتحت اسکے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ پانی کے حالات الگ ہیں اور پتھر اور ہوا کے الگ۔ اور یہ ہماری نادانی ہوگی کہ ہم ان سب کو ایک ہی قانون کے ماتحت سمجھ کر ایک ہی معیار سے ناپنے لگ جاویں۔ اسی طرح دنیا کی چیزوں کے معیار کے مطابق خدا کے متعلق اور خدا کے معیار کے مطابق دُنیا کے متعلق رائے نہیں لگائی جا سکتی بلکہ ہر اک کو اسکے مخصوص حالات کے مطابق الگ الگ معیار سے پرکھا جاویگا۔ اب اس اصل کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ خدا مخلوق نہیں مگر دنیا ضرور مخلوق ہے خدا کے متعلق تو ہم مندرجہ بالا بیان میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو اگر ہم خدا کو مخلوق مانیں یعنی اس کا کوئی خالق تسلیم کریں تو خدائیت کا مفہوم فوراً اس سے نکلکر اس کے خالق کیطرف منتقل ہو جاتا ہے یعنی مخلوق کا مفہوم ذہن میں آتے ہی خدا خدا نہیں

رہتا۔ دوسرے یہ کہ اسے مخلوق مانکر اسکی تمام ان صفات کا انکار کرنا پڑتا جو عقل کی رو سے عرش اُلوہیت کے لئے بطور ستون کے تسلیم کی جاتی ہیں اور جنکے بغیر خدا خدا نہیں رہ سکتا الغرض خدا کے متعلق یہ قطعی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ اب رہا دُنیا کا سوال۔ سو اسکے متعلق بھی مفصل بحث اوپر گذر چکی ہے کہ وہ اپنے حالات سے اپنے آپ کو مخلوق ثابت کر رہی ہے۔ اگر اسکے حالات ایسے نہ ہوتے۔ جنسے اس کا مخلوق ہونا ثابت ہوتا تو ہم بڑی خوشی سے اسے غیر مخلوق مان لیتے۔ لیکن جہاں خدا اپنے حالات سے اپنے آپ کو غیر مخلوق منوار ہا ہے وہاں یہ دُنیا زبان حال سے پُکار پُکار کر یہ شہادت دے رہی ہے کہ میں کسی بالا ہستی کی قدرت خلق کا کرشمہ اور اسی کے سہارے پر قایم ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ جسے اگر مخلوق مانا جاوے تو ہمیں اسکی کسی مخصوص صفت کا انکار کرنا پڑے بمقابلہ خدا کے کہ جسکو مخلوق مانکر اسکی تمام اصولی صفات کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ کما مرّ۔ مثلاً اگر ہم پانی کو مخلوق مانیں۔ تو اس کا کوئی طبعی خاصہ ایسا نہیں جس کا ہمیں انکار کرنا پڑے۔ اگر ہوا کو مخلوق مانیں تو پھر بھی ہوا کے تمام خواص برقرار رہتے ہیں انسان کو مخلوق مانیں تو اسکے انسان ہونے میں قطعًا کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ زمین اور چاند سورج کو مخلوق مانیں تو ان میں سے کسی کی طبعی صفات میں رخنہ واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر عناصر کو مخلوق قرار دیں تو پھر بھی انکی ماہیت اسی طرح قائم رہتی ہے۔ غرضیکہ دُنیا کی کوئی ایک چیز بھی خواہ وہ ادنیٰ ہے یا اعلیٰ مرکب ہے یا عنصر ایسی نہیں ہے کہ اسے مخلوق ماننے سے اسکی کسی صفت کا بُطلان لازم آوے بلکہ وہ مخلوق مانی جاکر بھی اسی طرح قایم و برقرار رہتی ہے جیسا کہ وہ اب عملاً دُنیا میں موجود ہے لیکن اگر خدا کو مخلوق قرار دیں تو اسکی تمام وہ صفات باطل چلی جاتی ہیں جو اسکی خدائیت کے لئے بطور ستون کے ہیں اور خدا خدا نہیں رہتا۔ پس یہ جہالت کا خیال ہے کہ چونکہ خدا کو غیر مخلوق ماننا پڑتا ہے اس لئے کیا حرج ہے کہ اس دُنیا کو ہی غیر مخلوق سمجھ لیا جاوے دیکھو پانی بوجہ سیال ہونیکے جس برتن میں ڈالا جاتا ہے اسکی شکل اختیار کر لیتا ہے مگر کون عقلمند ہے جو یہ کہے کہ اس میں کیا حرج ہے کہ پانی کی طرح پتھر کے متعلق بھی یہ سمجھ لیا جاوے کہ وہ بھی جس برتن میں رکھا جاویگا اسکی شکل اختیار کر لیگا؟ یہ نادانی اور جہالت کی باتیں ہیں جنکی طرف کوئی ہوش و

حواس رکھنے والا انسان توجہ نہیں کر سکتا۔ پس خدا غیر مخلوق ہے اس لئے کہ وہ مخلوق نہیں ہو سکتا یعنی اسکے لئے ناممکن ہے کہ وہ مخلوق ہو کیونکہ مخلوق ہوتے ہی وہ خدا نہیں رہتا۔ جیسا کہ پتھر کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ پانی کی طرح جس برتن میں ڈالا جاوے اسکی شکل و صورت اختیار کر لیا کرے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ پتھر نہیں رہتا۔ مگر اس دنیا کی کسی چیز کے لئے مخلوق ہونا اسکی کسی طبعی صفت کے خلاف نہیں ہے پس فرق ظاہر ہے۔ ابتک مَیں نے صرف یہ بتایا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے مخلوق قرار دینے سے اسکی کسی صفت کا انکار کرنا پڑے۔ اور چونکہ عام اصول یہی ہے کہ جب تک کسی چیز کو مخلوق قرار دینے کے رستہ میں کوئی طبعی روک نہ ہو اسے مخلوق ماننا چاہیئے۔ اس لئے ثابت ہؤا کہ یہ دُنیا مخلوق ہے۔ اب مَیں مختصر طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ دُنیا کے مخلوق ماننے جانیکے رستہ میں کوئی روک نہیں بلکہ دُنیا کے حالات ایسے ہیں کہ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اسے مخلوق قرار دیں۔ مثلاً اوّل یہ کہ دنیا میں کثرت ہے یعنی دُنیا کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ بیشمار چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور یہ عظیم الشان کثرت جس کے حصر تک انسان آجتک قادر نہیں ہو سکا اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ دُنیا کا کوئی خالق و مالک ہونا چاہیئے جو ان کثیر التعداد افواج کو ایک واحد نظام کے ماتحت جمع رکھ سکے لیکن اس کے مقابلہ میں خدا کا وجود مذہباً بھی اور عقلاً بھی واحد بلکہ احد مانا جاتا ہے جس کیے اوپر کسی منظم یعنی ایک انتظام میں جمع رکھنے والے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے دُنیا میں اختلاف ہے یعنی دُنیا کسی ایک قسم کی چیزوں کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ بیشمار مختلف الصورت اور مختلف الجنس چیزوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک الگ الگ خواص رکھتی اور الگ الگ دائرہ میں چکر لگاتی اور الگ الگ قانون کے ماتحت جاری ہے۔ پس یہ اختلاف بھی ایک خالق و مالک و مدبر و متصرف ہستی کی ضرورت کو ثابت کر رہا ہے جو ان لاتعداد مختلف چیزوں کو باوجود الگ الگ قانون کے ماتحت ہونیکے ایک مجموعی قانون کی لڑی میں پرو سکے۔ مگر خدا کی ذات کے متعلق بوجہ ایک ہونے کے اختلاف کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ تیسرے دنیا کی ہر چیز کو زوال اور تغیر لاحق ہے یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک حالت پر قائم رہتی ہو۔ بلکہ ہر وقت ہر چیز بدل رہی ہے اور ہر وقت ہر چیز اپنی محدود عمر کی گھڑیوں کو کم کرتی چلی جا رہی ہے اور یہ حالت بھی اس بات

کا ثبوت ہے کہ یہ دُنیا خود بخود نہیں بلکہ کسی بالا ہستی کے قبضہ تصرف کے ماتحت ہے لیکن خدا کا وجود غیر متغیر اور زمانہ کے اثر سے بالا مانا جاتا ہے۔ چوتھے دُنیا کی ہر چیز اپنی طاقتوں اور اپنے طبعی قوٰی اور اپنے دائرہ عمل میں محدود اور مقید ہے اور دُنیا کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسکی کوئی ایک صفت بھی درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی یعنی حدود و قیود سے آزاد نظر آوے پس خواص و صفات کی یہ حد بندی بھی ایک حد مقرر کرنیوالی ہستی پر دال ہے یعنی ایک ایسی ہستی کیطرف اشارہ کر رہی ہے جس نے ان بیشمار مختلف چیزوں کو ایک قانون کے ماتحت معیّن حدود کے اندر محدود کر رکھا ہے اور جو خود ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ پانچویں دنیا کی کوئی چیز قایم بالذات نہیں بلکہ اپنے قیام کے واسطے دوسروں کے سہارے کی محتاج ہے اور سائنس کی جدید تحقیقاتوں نے تو اس بات کو یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کی ہر اک چیز اپنی زندگی کے قیام کے واسطے باقی تمام دوسری چیزوں پر اثر ڈال رہی اور ان سے اثر لے رہی ہے گویا کوئی چیز بھی اپنی ذات میں قائم نہیں پس دنیا کی ہر اک چیز کا غیر قائم بالذات ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دنیا خود بخود اپنے آپ سے نہیں بلکہ کسی بالا ہستی کے سہارے پر قائم ہے جس نے ایک حکیمانہ نظام سے ہر اک چیز کو اپنی اپنی جگہ میں قائم کر رکھا ہے چھٹے دُنیا میں ایک خاص Design یعنی ترتیب پائی جاتی ہے جو ایک مدرک بالا رادہ مرتبہ ہستی کو چاہتی ہے لیکن خدا کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ساتویں دنیا کی ہر چیز اپنے حالات سے ایک خاص غرض و مقصد کے ماتحت چلتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ علّت غائی جو نیچر کے مطالعہ سے ہر چیز کے دور زندگی میں ظاہر ہو رہی ہے اس بات کو چاہتی ہے کہ اس عالم کے پیچھے ایک اور ہستی ہو جو خود پس پردہ رہ کر نظام عالم کی غیر مرئی تاروں کو ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور ایک معیّن پروگرام کے ماتحت اس دنیا کو ایک خاص مقصد و منتہی کیطرف لے جا رہی ہے۔ لیکن اسکے مقابلہ میں خدا کے وجود کے متعلق قطعًا کوئی علت غائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنی ذات میں احد۔ اوّل و آخر قائم و صمد اور جامع جمیع کمالات مانا جاتا ہے۔ اسی طرح دُنیا کے باقی حالات و کوائف بھی اسکے مخلوق ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔ الغرض دُنیا کے حالات ہمیں اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ ہم

اسے مخلوق و مملوک قرار دیں۔ مگر اسکے مقابل میں خدا کے حالات نہ صرف یہ کہ اس کے مخلوق ہونے کے متقاضی نہیں بلکہ خدائیت اور مخلوقیت کا مفہوم اس طرح پر ایک دوسرے کی ضد میں واقع ہوا ہے کہ کبھی بھی ایک وجود میں جمع نہیں ہو سکتا۔ پس یہ نادانی اور لاعلمی کا سوال ہے کہ اگر خدا غیر مخلوق ہو سکتا ہے تو کیوں نہ اس دنیا کو ہی غیر مخلوق سمجھ لیا جاوے اور حق یہی ہے کہ ہر اک چیز مخلوق ہے مگر خدا جسکے اوپر کوئی خالق نہیں اور ہر اک چیز محکوم ہے مگر خدا جسکے اوپر کوئی حاکم نہیں اور ہر اک چیز مملوک ہے مگر خدا جسکے اوپر کوئی مالک نہیں۔ خدا کی ذات وہ مرکزی نقطہ ہے جسپر تمام خطوط جمع ہوتے ہیں اور جس کے آگے کوئی رستہ نہیں۔ مبارک وہ جو اس نقطہ کو پہچانتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچ جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی آنحضرت صلعم کا یہ قول آتا ہے کہ تم ہر چیز کے متعلق یہ پوچھ سکتے ہو کہ اسے کس نے پیدا کیا ہے لیکن جب خدا پر پہنچو تو پھر اس سوال کو بند کر دو۔ کوئی نادان خیال کرتا ہو گا کہ آپ نے اپنے متبعین کے لئے آزادانہ تحقیق کا راستہ بند کرنا چاہا ہے اور گویا شکوک سے بچانے کے لئے ان کو اس علمی سوال میں پڑنے سے ہی روک دیا ہے حالانکہ آنحضرت صلعم کا بھی یہی منشا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ہر چیز کے متعلق مخلوق ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا ہے مگر خدا کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص یہ سوال اُٹھاتا ہے تو یہ اسکی جہالت کا ثبوت ہے پس آنحضرت صلعم نے علم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بلکہ جہالت کا دروازہ بند کیا ہے۔ تحقیق کے رستہ میں روک نہیں ڈالی بلکہ توہم پرستی میں پڑنے سے منع فرمایا ہے اللھم صل علیہ وعلی آلہ وسلم۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ وسیع عالم مع اپنے نہایت درجہ حکیمانہ نظام کے جو اسکی کثیر التعداد مختلف الجنس تغیر پذیر غیر قائم بالذات محدود اشیاء میں انفرادی اور مجموعی طور پر کام کرتا نظر آتا ہے زبان حال سے اس بات کی شہادت پیش کر رہا ہے کہ وہ خود بخود اپنے آپ سے نہیں بلکہ ایک بالاہستی کی قدرت خلق سے عالم وجود میں آیا ہے اور اسی بالاہستی کے سہارے پر قائم اور جاری ہے اور یہ بالاہستی خود غیر مخلوق اور غیر مملوک ہے کیونکہ وہ آخری نقطہ ہے جسپر تمام سلسلے ختم ہوتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک نظم پر اس دلیل

کی بحث کو ختم کرتا ہوں :-

کس قدر ظاہر ہے نور اس مبداء الانوار کا
بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا

چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بیکل ہو گیا
کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمالِ یار کا

اس بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے
مت کرو کچھ ذکر ہم سے ترک یا تاتار کا

ہے عجب جلوہ تری قدرت کا پیارے ہر طرف
جس طرف دیکھیں وہی رہ ہے ترے دیدار کا

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں
ہر ستارے میں تماشہ ہے تری چمکار کا

تُو نے خود روحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک
اس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا

کیا عجب تُو نے ہر اک ذرہ میں رکھے ہیں خواص
کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر اُن اسرار کا

تیری قدرت کا کوئی بھی انتہا پاتا نہیں
کس سے کھل سکتا ہے پیچ اس عقدۂ دشوار کا

خوبرویوں میں ملاحت ہے ترے اس حُسن کی
ہر گل و گلشن میں ہے رنگ اس تری گلزار کا

چشمِ مستِ ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

آنکھ کے اندھوں کو حائل ہو گئے سو سو حجاب
ورنہ قبلہ تھا ترا رُخ کافر و دیندار کا

ہیں تری پیاری نگاہیں دلبرا اک تیغ تیز
جس سے کٹ جاتا ہے سب جھگڑا غمِ اغیار کا

تیرے ملنے کیلئے ہم مل گئے ہیں خاک میں
تا مگر درماں ہو کچھ اس ہجر کے آزار کا

ایک دم بھی کل نہیں پڑتی مجھے تیرے سوا
جاں گھٹی جاتی ہے جیسے دل گھٹے بیمار کا

شور کیسا ہے ترے کوچے میں لے جلدی خبر
خوں نہ ہو جائے کسی دیوانہ مجنوں وار کا

نیکی بدی کے شعور کی دلیل

اس کے بعد جو عقلی دلیل ہستی باریتعالیٰ کے متعلق میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اس اخلاقی قانون سے تعلق رکھتی ہے جو ہر انسان کی فطرت میں مرکوز ہے گویا جیسا کہ گذشتہ دلیل اس طبعی قانون سے تعلق رکھتی تھی جو انسان اور اس عالمِ دنیوی کی دوسری چیزوں میں انفرادی اور مجموعی طور پر کام کرتا ہؤا نظر آتا ہے اسی طرح یہ دلیل جو میں اب بیان کرنا چاہتا ہوں اس اخلاقی قانون پر مبنی ہے جو ہر فرد بشر کی فطرت میں کام کر رہا ہے اور جس کے وجود سے کوئی عقلمند شخص انکار نہیں

کر سکتا۔ نیکی بدی کا شعور انسان کی فطرت کے اندر مرکوز ہے اور روئے زمین پر کوئی انسان بھی ایسا نہیں ملے گا جسکے اندر یہ شعور مفقود ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ کسی انسان کی فطرت بیرونی اثرات کے نتیجہ میں کمزور ہو جاوے یا ایسی طرح دب جاوے کہ گویا وہ بالکل مر ہی گئی ہے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی موقعہ پر وہ اپنا ظہور کئے بغیر نہیں رہتی ہر انسان خواہ اسکی حالت کیسی ہی بری ہو فطرتاً نیکی کو پسند کرتا اور بدی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بیشک ایک نہایت شقی القلب پرانا عادی چور جس نے چوری کر کر کے اور لوگوں کے اموال کو ان سے ناجائز طور پر چھین چھین کر اپنی فطرت کو گناہ کے تاریک و تار پردوں میں دفن کر رکھا ہو۔ بسا اوقات لوگوں کے طعنوں سے تنگ آکر یا اپنے آپ کو اپنے ضمیر کے مخفی نشتروں کے بچانے کے لئے ڈھیٹ بنکر ایسی باتیں کہنے لگ جاتا ہے کہ میرا چوری کرنا کوئی برا فعل نہیں ہے کیونکہ جس طرح لوگ مختلف پیشے اختیار کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی محنت کر کے اور اپنی جان کو مشقت اور خطرہ میں ڈال کر اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالتا ہوں لیکن باوجود اسکے اس پر ایسے اوقات ضرور آتے رہتے ہیں کہ جب اسکی فطرت اسے ملامت کرتی ہے کہ تیرا یہ فعل نہایت درجہ ناواجب اور ظالمانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جب ایک چور جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے اور موت اسے قریب نظر آتی ہے تو وہ چوری کی زندگی کو ترک کر کے اپنے ضمیر سے صلح کر کے نیکی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اگر کسی شخص کی فطرت بالکل ہی خاموش ہو چکی ہو حتیٰ کہ وہ اپنی بداعمالیوں کو ہی اپنے لئے موجب فخر سمجھنے لگ جاوے اور بظاہر حالات ایسا نظر آوے کہ اسکے اندر نیکی و بدی کا شعور بالکل ہی مفقود ہو چکا ہے تو پھر بھی نظر غائر سے دیکھنے والے پر یہ بات مخفی نہیں رہے گی کہ ایسا شخص بھی اس فطری جوہر سے بالکل خالی نہیں ہے جو نیکی بدی کے شعور سے موسوم ہوتا ہے کیونکہ گو دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ بالکل مردہ فطرت نظر آتا ہے۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکے ساتھ دوسرے لوگ کس طرح معاملہ کریں تو اسکی دبی ہوئی فطرت فوراً تمام پردوں کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے اور وہ اس بات کیلئے مطلقاً تیار نہیں ہوتا کہ اپنا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حق بھی جو وہ نیکی بدی کے فطری شعور کے ماتحت سمجھتا ہے کہ اسے حاصل

ہے ترک کر دے۔ مثلاً دوسروں کا مال چرانے میں ایک پُرانا عادی چور جس نے چوری کر کر کے اپنی فطرت کو مار رکھا ہے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ سکتا ہے یا کم از کم یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ میں حق بجانب ہوں۔ لیکن اگر دوسرا کوئی شخص اسکے مال پر ہاتھ ڈالے تو فوراً اسکی نیم مردہ فطرت جوش میں آکر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک زانی جو دوسروں کی بہو بیٹیوں اور بہنوں اور بیویوں کو خراب کرنے کے درپے رہتا ہے اور بعض اوقات اپنے اس گندہ فعل میں ایسا انہماک پیدا کر لیتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو وہ بے شرم بنکر یہاں تک کہدیتا ہے کہ یہ کوئی بُرا کام نہیں ہے جو میں کرتا ہوں کیونکہ میں اپنی خوشی کو پُورا کرتا ہوں اور دوسروں کو اس سے کوئی سروکار نہیں لیکن جب خود اسکے اندرون خانہ پر کوئی دوسرا بدبخت ہاتھ ڈالتا ہے تو پھر اسکی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ اگر مجھے اپنی خوشی کے پُورا کرنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا شخص بھی اپنی خوشی کو پُورا نہ کرے۔ اسی طرح ایک کذّاب دروغگو دوسروں کو دھوکا دیکر خوش ہو سکتا ہے لیکن جب کوئی شخص جھوٹ بولکر خود اسے دھوکے میں ڈالتا ہے تو وہ غیظ و غضب سے بھر کر انتقام لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ الغرض نیکی اور بدی کا شعور فطرتاً ہر انسان کے اندر موجود ہے اور یہ شعور اس بات کی ایک زبردست دلیل ہے کہ انسان خود بخود کسی اتفاق کا ثمرہ نہیں اور نہ کسی اندھے قانون کا نتیجہ ہے بلکہ ایک مدرک بالارادہ علیم و حکیم بالا ہستی نے اسے ایک خاص غرض کے ماتحت پیدا کیا ہے اور وہ غرض یہی ہے کہ انسان اپنے اس فطری شعور کو جو بطور ایک تخم کے اسکے اندر رکھا گیا ہے۔ نشوونما دیکر اپنے لئے اعلےٰ ترقیات کے دروازے کھولے اور اس کامل منبع حسن و احسان اور اس وحید چشمۂ حیات یعنی ذات باریتعالیٰ کا عکس اپنے اندر پیدا کرتا ہُوا ابدالآباد کے لئے ہر قسم کے حسن و احسان کی بلند ترین چوٹیوں کی طرف چڑھتا چلا جاوے۔ خوب غور کر لو کہ یہ نیکی بدی کا شعور جو ہر انسان کی فطرت میں مرکوز ہے اور یہ مخفی نور قلب جس کا چشمہ ہر ابن آدم کے سینہ سے اُبل اُبل کر پھُوٹ رہا ہے کبھی کسی اندھے اتفاق یا محض ارتقا کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے صاف ثابت ہوتا

ہے کہ اس فطری جذبے کو پیدا کرنے والی کوئی مدرک بالارادہ ہستی ہے جس نے انسان کو اس غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس فطری جذبے کو ترقی دیکر اعلیٰ انعامات کا وارث بنے۔ ہم نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص جو ذرا بھی فکر و تدبر کا مادہ رکھتا ہے نیکی و بدی کے اس فطری شعور کو جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور جسکے ماتحت انسان سے ہمیشہ طبعی طور پر بعض نیک افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں محض کسی اتفاقی قانون یا فطری ارتقا کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا ایک مشین کیطرح ہے جسکے مختلف پُرزے اُس مشین کی اندرونی صنعت کے ماتحت خود بخود اپنے اپنے حلقہ میں چلتے رہتے ہیں اور اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ خدا کوئی نہیں ہے۔ ایسے لوگ دیانتداری کے ساتھ غور کریں کہ کیا یہ فطری شعور جس سے ہر انسان نیکی کے اختیار کرنے کی طرف رغبت محسوس کرتا ہے کسی اندھی (Mechanism) کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی ایسی مشین ہے یا ہو سکتی ہے جو خود بخود اپنی کسی اندرونی طاقت سے ایسے رنگ میں چلے کہ وہ غریب اور امیر خوش بخت اور مصیبت زدہ۔ جوان اور بوڑھے۔ کمزور اور توانا۔ یتیم اور غیر یتیم کے معاملہ میں فرق کرتی جاوے۔ مثلاً اگر آٹے کی مشین ہو تو ایک غریب یا مصیبت زدہ شخص یا بوڑھے یا کمزور شخص یا ایک یتیم کا آٹا زیادہ اچھا اور زیادہ جلدی پیس دے۔ اور ایک امیر اور خوشحال اور جوان اور توانا اور زندہ والدین رکھنے والے بچے کا کام صرف معمولی طور پر کرے؟ اور اگر کوئی ایسی مشین نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ تو کیا انسانی قلب میں فطری طور پر نیکی بدی کے شعور کا ہونا اور انسان کا فطرتاً نیکی کو پسند کرنا۔ اور حالات کے مناسب رحم کھانا یا محبت دکھانا یا عفو سے کام لینا یا مصیبت زدہ کی امداد کرنا یا قربانی اور ایثار دکھانا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کی زندگی خود بخود ایک مشین کے طور پر کام نہیں کر رہی بلکہ اسکے پیچھے ایک اور ہستی ہے جس نے یہ جذبات ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت اسکی فطرت میں مرکوز کئے ہیں۔ اسی طرح یہ ایک فطری خاصہ ہے کہ انسان بدی کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ جب خود اس سے بھی غفلت یا جوش کی حالت میں کسی بدی کا ارتکاب ہوتا ہے تو بعد میں وہ اپنے قلب کے اندر پشیمانی اور ندامت کو محسوس کرتا ہے اور یہ کیفیت بھی اس بات کا

ثبوت ہے کہ انسانی زندگی ایک محض مشین کے طور پر نہیں بلکہ کسی بالا ہستی نے اسے ایک خاص مقصد کے ماتحت پیدا کیا ہے اور اسکے قلب کے قلعہ پر یہ فطری پہرہ دار کسی خاص غرض و غائت کے ماتحت کھڑے کئے گئے ہیں۔ انسان کے سینہ میں بیسیوں جذبات کا خزانہ مرکوز ہے اور ہر جذبہ کے متعلق یہ شعور بھی اسکی فطرت کے اندر بطور تخم کے ودیعت کیا گیا ہے کہ اسکا جذبہ کا یہ استعمال اچھا ہے اور وہ بُرا۔ اور یہ کہ اسے ہمیشہ اچھے استعمال کو اختیار کرنا چاہیئے اور بُرے استعمال کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور شریعت ہمیشہ فطرت انسانی کے انہی مخفی تخموں کی آبپاشی کرنے اور انکے اگانے اور ترقی دینے کے لئے نازل کی جاتی ہے۔

الغرض فطرت انسانی کے اندر نیکی بدی کا شعور موجود ہونا اس بات کا ایک زبردست ثبوت ہے کہ انسان خود بخود اپنے آپ سے نہیں ہے اور نہ یہ کہ اسکی زندگی ایک مشین کے طور پر چل رہی ہے بلکہ اسکے پیچھے ایک مدرک، بالارادہ ہستی کا ہاتھ ہے جس نے اسے ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کیا ہے وھو المراد۔ اگر اس جگہ کسی کو یہ اعتراض پیدا ہو کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ شعور جسے فطری شعور کہا جاتا ہے گرد و پیش کے حالات اور خاندانی اور ملکی روایات کا نتیجہ ہو یعنی اگر لوگ نیکی کو اچھا سمجھتے اور بدی سے نفرت کرتے ہیں تو اسکی وجہ کوئی فطری تقاضا نہ ہو بلکہ محض یہ وجہ ہو کہ لوگوں نے تجربہ سے اچھے کاموں کو اچھا سمجھ لیا ہو اور بُرے کاموں کو بُرا۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ ایک لمبے عرصہ کے بعد یہ خیال نسل انسانی میں قائم و راسخ ہو کر ایک فطری شعور کے طور پر نظر آنے لگ گیا ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو یہ اعتراض بظاہر قابل غور نظر آتا ہے لیکن اگر ذرا تدبر اور فکر سے کام لیا جاوے تو حقیقت حال ہرگز مخفی نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے کہ نیکی بدی کا احساس دو ہی طرح پیدا ہو سکتا ہے یعنی یا تو اس کا باعث ایک لمبے زمانہ کا تجربہ اور گرد و پیش کے حالات ہیں جیسا کہ معترض کا خیال ہے اور یا یہ کسی بالا ہستی کی فطری ودیعت ہے جیسا کہ اسلام ہمیں سکھاتا ہے۔ ان دو کے سوا کوئی تیسری صورت ذہن میں نہیں آتی۔ اور اب ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کونسی صورت صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔ سو سب سے پہلی بات جو نیکی بدی کے شعور میں ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس شعور کے اندر خواہ وہ دنیا کی کسی قوم اور کسی زمانہ کے ساتھ تعلق

رکھتا ہو ایک یک صورتی نظر آتی ہے جسے انگریزی میں (Uniformity) کہتے ہیں
یعنی یہ شعور دنیا کی ہر قوم میں اور دنیا کے ہر زمانہ میں اپنی اصل کے لحاظ سے ایک ہی صورت
اور ایک ہی رنگ ڈھنگ کا نظر آتا ہے جو اس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ وہ تجربہ اور گردو
پیش کے حالات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ کسی بیرونی طاقت کیطرف سے جو سب پر بالا اور فائق ہے
فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ خوب سوچ لو کہ جو بات تجربہ اور گردوپیش کے حالات سے
پیدا ہوتی ہے وہ ضرور مختلف قوموں اور مختلف زمانوں میں مختلف ہونی چاہیئے خصوصاً ابتدائی
زمانہ میں جبکہ ہر قوم عموماً ہر دوسری قوم سے بے خبر ہوتی تھی اور ایک دوسرے کے ساتھ میل
جول اور اختلاط کے ذرائع مفقود تھے یہ شعور لازماً مختلف اقوام میں مختلف صورتوں میں پیدا
ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ہر قوم کا تجربہ اور ہر قوم کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قومی عادات و اطوار جو یقیناً گردوپیش کے حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں ہر
قوم میں مختلف نظر آتے ہیں۔ پس اگر نیکی بدی کا شعور بھی اقوام کے حالات اور تجربہ کا نتیجہ ہوتا تو
یہ ضروری تھا کہ وہ ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں مختلف صورتوں میں نظر آتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے
بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ شعور دنیا کی ہر قوم اور ہر زمانہ میں ہمیشہ یک صورتی یعنی (Uniformity)
کی حالت میں پایا گیا ہے۔ مثلاً اگر ہم دُنیا کی دو ایسی قوموں کو لیں جن کے حالات بالکل ایک
دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً ایک بہت متمدّن اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہو اور دوسری
بالکل وحشی اور جاہل اور غیر مہذب تو دونوں میں باوجود اس درجہ اختلاف کے یہ شعور جہاں تک
مجرّد شعور کا تعلق ہے بالکل ایک جیسا اور ایک ہی صورت و شکل کا نظر آئے گا۔ اور اگر اختلاف
ہوگا تو صرف ان معاملات میں ہوگا جو اس فطری تخم کے نشوونما سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک
قوم میں یہ فطری شعور ایک خاص رنگ میں اور خاص رستہ پر نشوونما پایا ہوا معلوم ہوگا۔ اور
دوسری میں بالکل دوسرے رنگ اور دوسرے رستہ پر۔ مگر جب انکو بعد کے تاثرات سے
الگ کرکے انکی اصل کے لحاظ سے دیکھا جاویگا تو دونوں میں ایک ہی صورت اور ایک ہی
رنگ ڈھنگ نظر آئیں گے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شعور اپنی اصل کے لحاظ سے
حالات اور تجربات کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک فطری ودیعت ہے جس سے کوئی ابن آدم محروم نہیں

دوسری دلیل اس بات کی کہ یہ شعور ایک فطری امر ہے اور کسی خارجی اثر کا نتیجہ نہیں یہ ہے کہ اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو بعض ایسے معاملات میں بھی یہ شعور انسان کے اندر پایا جاتا ہے کہ جو کسی عقلمند کے نزدیک تجربہ اور گرد و پیش کے حالات کا نتیجہ نہیں ہو سکتے یعنی وہ معاملات اپنی نوعیت میں ایسے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ان کا نفع یا نقصان انسانی تجربہ میں آکر معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے اگر ان کے متعلق کوئی شعور پایا جاتا ہے تو وہ ہرگز حالات یا تجربہ کا نتیجہ نہیں کہلا سکتا بلکہ لاریب ایسے شعور کا منبع کوئی بالا طاقت سمجھی جائیگی جس نے خاص حکمت کے ماتحت یہ شعور ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ مُردہ کا احترام کسی نہ کسی صورت میں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پایا جاتا رہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ شعور اپنی نیچر کے لحاظ سے ایسا ہے کہ اسے تجربہ اور گرد و پیش کے حالات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اور کسی صورت میں بھی اسے سوائے فطرت کی آواز کے کسی اور طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ بعض ایسی باتوں میں نیکی بدی کا شعور پایا جانا جن کا نفع نقصان کبھی بھی تجربہ میں آکر معلوم نہیں ہوا اور نہ جن میں بظاہر کوئی مادی فائدہ نظر آتا ہے اس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ یہ شعور تجربہ اور حالات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک فطری امر ہے جو کسی بالا ہستی نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے وھو المراد۔ تیسری دلیل اس بات کی کہ نیکی بدی کا شعور ایک فطری شعور ہے یہ ہے کہ یہ شعور بعض صورتوں میں قومی روایات کے خلاف بھی ظاہر ہوتا ہے جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ قومی روایات کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ نتیجہ کبھی بھی نتیجہ پیدا کرنے والی چیز کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ مثلاً ایک قوم ایک لمبے زمانہ کے حالات کے ماتحت اپنے اندر سخت دلی پیدا کر لیتی ہے اور اسکے افراد میں ظلم و ستم اور سخت گیری کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے اور قومی روایات ہر فرد قوم کو سنگدل اور بیرحم اور قسی القلب بنا دیتی ہیں۔ لیکن باینہمہ اگر اسکے افراد کی فطرت اور سائیکالوجی کا گہرا مطالعہ کیا جاوے اور انکے سوانح زندگی کو غور سے دیکھا جاوے تو باوجود اس سنگدلی کے پردہ کے جس نے انکو ڈھانپا ہوا ہوتا ہے انکے اندر رحم

کا جذبہ بھی ضرور نظر آئے گا۔ اور کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی صورت میں یہ مخفی جذبہ اپنی جھلک دکھلا جائے گا۔ اسی طرح ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک قوم ایک لمبے عرصہ تک ایسے حالات میں سے گذری ہے جس نے اسکے اندر رحم اور عفو اور نرمی کے خیالات کی پرورش کی ہے اور اسکے ہر فرد کے لئے قومی روایات صرف رحم سے وابستہ ہوگئی ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جاویگا تو معلوم ہوگا کہ باوجود ان حالات کے ایسی قوم کے ہر فرد میں یہ جذبہ پایا جائیگا کہ اگر اصلاح کی صورت سختی اور گرفت کے ساتھ ہوتی ہو۔ اور عفو کرنا اور رحم کھانا نقصان کا موجب ہو تو ایسی صورت میں عفو اور رحم سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ گرفت اور مناسب سزا کا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ الغرض نیکی بدی کا یہ فطری شعور بعض اوقات قومی روایات اور ملکی حالات کے خلاف بھی پایا جاتا ہے کیونکہ وہ فطرت کا حصہ ہے اور فطرت گو حالات کے اثر کے نیچے دب جاوے مگر کبھی بھی وہ بالکل مُردہ نہیں ہوسکتی۔ اور اسی لئے بسا اوقات یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص کے قومی یا خاندانی حالات وروایات اسکی طبیعت کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیتے ہیں اور گویا ان حالات وروایات کے نتیجہ میں اسکے اندر ایک نئی فطرت قائم ہوجاتی ہے جسے فطرت ثانیہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی جب اصلی فطرت کو کوئی تحریک ملتی ہے تو وہ ایک بند آتش فشاں پہاڑ کی طرح فطرت ثانیہ کے پردوں کو پھاڑ کر باہر آجاتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ بیشک حالات وروایات کے ماتحت بھی ایک رنگ کی فطرت قائم ہوجاتی ہے لیکن یہ فطرت ثانیہ ہے نہ کہ فطرت اصلیہ۔ اور فطرت اصلیہ وہی ہے جسکو حالات وروایات ملکی یا تجربات قومی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر انسان کی خلقت کا حصہ ہے اور یہ فطرت اصلیہ جسکے اندر ایک نہایت حکیمانہ رنگ میں نیکی بدی کا شعور ودیعت کیا گیا ہے اس بات کا ایک روشن ثبوت ہے کہ اسکے پیچھے ایک مدرک بالارادہ خالق فطرت کا ہاتھ ہے جس نے ایک خاص غرض وغایت کے ماتحت یہ جوہر اسکے اندر مرکوز کردیا ہے چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا یعنی خدا نے ہر انسان کی فطرت میں بدی اور نیکی کا شعور رکھدیا ہے اور اسے بتادیا ہے کہ یہ راستہ بُرا ہے اور یہ راستہ اچھا۔ اور دوسری جگہ فرماتا ہے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ یعنی ہم نے انسان کو نیکی اور بدی ہر دو کے

رستے بتا دیئے ہیں اور اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ نیکی کے رستہ کو اختیار کرے یا بدی کے رستہ کو۔ الغرض ہر انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے شعور کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے نہیں ہے اور نہ وہ کسی اندھے قانون کا نتیجہ ہے اور یہ ایک ایسی روشن دلیل خدا کی ہستی کی ہے کہ جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا ۔

قبولیتِ عامہ کی دلیل

اس کے بعد جو دلیل میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ قبولیت عامہ کی دلیل ہے اور یہ دلیل اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا میں کسی خیال یا عقیدہ کی عالمگیر مقبولیت جو ہر زمانہ میں قائم رہی ہو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خیال یا عقیدہ اپنے اصل کے لحاظ سے حق و راستی پر مبنی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے

اَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (رعد رکوع ۲) یعنی "جو چیز لوگوں کے واسطے حقیقی طور پر مفید اور نفع بخش ہوتی ہے وہی دُنیا میں مستقل طور پر قائم ہوتی ہے اور فضول اور بے نفع چیز کو یہ ثبات کبھی حاصل نہیں ہوتا"۔ اسی طرح سائنس کا ایک اصل ہے جسے انگریزی میں سَرْوائیول آف دی فٹسٹ کہتے ہیں جسکے یہ معنی ہیں کہ زندگی کے جنگ میں وہی چیز سلامت رہتی ہے جو زیادہ مفید اور قائم رہنے کی زیادہ اہل ہوتی ہے اور دوسری چیزیں جو اسکے مقابل میں ہوتی ہیں مٹ جاتی ہیں اور ہمارا مشاہدہ بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ دُنیا میں حقیقی اور دائمی ثبات صرف نفع بخش چیز کو حاصل ہوتا ہے اور ایک ضرر رساں باطل یا غیر مفید چیز کبھی بھی مستقل اور عالمگیر فروغ حاصل نہیں کر سکتی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ کوئی باطل یا غیر مفید چیز دُنیا میں قائم ہی نہیں ہو سکتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز کا قیام دائمی اور عالمگیر نہیں ہو سکتا بلکہ عارضی اور محدود ہوتا ہے۔ اب اس اصل کے ماتحت ہم سوال زیر بحث پر نظر ڈالتے ہیں تو ایمان باللہ کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ثابت ہوتا ہے جس سے کسی عقلمند کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں جتنی بھی قومیں آباد ہیں خواہ وہ بڑی ہیں یا چھوٹی۔ متمدن ہیں یا غیر متمدن۔ تعلیم یافتہ ہیں یا جاہل۔ غرض جتنی بھی قومیں ہیں اور جہاں بھی ہیں وہ باوجود اپنے بے شمار اختلافات کے اس بات میں متفق ہیں کہ یہ دنیا و مافیہا خود بخود اپنے آپ سے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خالق و مالک ہے اور یہ خیال صرف اس

زمانہ کی اقوام تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ جس جس زمانہ کی بھی تاریخ ہمارے سامنے محفوظ ہے اس میں بلا استثناء یہی منظر نظر آتا ہے کہ کوئی قوم بھی اس عقیدہ سے خالی نہیں کہ یہ دنیا کسی بالاہستی کی مخلوق و مملوک ہے۔ اس بالاہستی کی صفات میں اختلاف ہے اور بہت بڑا اختلاف ہے۔ کوئی قوم خدا کو کسی صورت اور کسی شکل میں پیش کرتی ہے تو کوئی کسی میں۔ پھر کوئی قوم خدا کو ایک مانتی ہے اور اسکے نیچے یا اوپر کسی دوسرے معبود کی قائل نہیں تو کسی نے بہت سے بڑے اور چھوٹے معبود بنا رکھے ہیں اور ان سب کے سامنے کم و بیش عبودیت کا خراج پیش کرنے پر مصر ہے۔ غرض خدا کی ذات و صفات کے متعلق مختلف اقوام میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن باوجود اس درجہ اختلاف کے تمام اقوام کے دین و مذہب کا مرکزی نقطہ یہی نظر آتا ہے کہ یہ دنیا و مافیہا خود بخود نہیں بلکہ کسی بالاہستی کی قدرت نمائی کا کرشمہ ہے کیا یہودی اور کیا عیسائی کیا ہندو اور کیا مسلمان کیا سکھ اور کیا پارسی کیا جینی اور کیا بدھ پھر کیا شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین اور کیا جنوبی افریقہ کے ہاٹن ٹاٹ اور زولو۔ کیا مغربی افریقہ کے حبشی اور کیا آسٹریلیا کے وحشی۔ کیا منطقہ منجمدہ کے اسکیمو۔ اور کیا نیوزی لینڈ کے میوری۔ کیا ہندوستان کے گونڈ اور سنتھال اور کیا چین کے کنفیوشس اور ٹوی۔ پھر اگر زمانہ کے لحاظ سے نظر ڈالیں تو کیا موجودہ زمانہ کی دنیا اور کیا غیر تاریخی زمانہ کے لوگ کیا وسطی زمانہ کی اقوام۔ اور کیا ابتدائی زمانہ کے قبائل۔ غرض جس قوم اور جس زمانہ کو لیں یہ عقیدہ کسی نہ کسی صورت میں خواہ وہ مخفی ہو یا ظاہر ضرور ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ دنیا کسی بالاہستی کے قبضۂ تصرف میں ہے۔ پس باوجود اس قدر عظیم الشان اور کثیر التعداد اختلافات کے تمام اقوام عالم کا ہر زمانہ میں اس بات پر متفق نظر آنا کہ اس دنیا کا کوئی خدا ہے قطع نظر اسکے کہ اسکی کیا صفات ہیں یا وہ ایک ہے یا زیادہ ہیں خدا تعالیٰ کے وجود پر ایک ایسی دلیل ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ قومیں اس بات کا دعویٰ رکھتی ہیں کہ ہم نے خدا کو دیکھا یا پہچانا ہے اور اسکی صفات کا مشاہدہ کیا ہے اور گویا اس معاملہ میں اپنی عینی شہادت کو پیش کرتی ہیں بلکہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ تمام اقوام عالم باوجود اپنے بے شمار مذہبی اختلافات کے ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ کی ذات پر کسی نہ

کسی صورت میں ایمان لانے کا دعویٰ رکھتی رہی ہیں۔ اور یہ مجرد دعویٰ اپنی عالمگیر مقبولیت کی وجہ سے اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی کوئی خدا ہے۔ خوب سوچ لو کسی عقیدہ کو اس قدر قبولیت حاصل ہو جانا کہ وہ تمام دُنیا کا عقیدہ بنجاوے اور تمام قومیں اسکو اپنے دین و مذہب کا مرکزی نقطہ قرار دیں اور جب سے کہ دُنیا کی تاریخ محفوظ ہے آجکے زمانہ تک کوئی ایک مثال بھی ایسی نظر نہ آوے کہ کوئی قوم بحیثیت قوم ہو نیکے اس عقیدہ سے قطعی طور پر مُنکر ہوئی ہو اس عقیدہ کے صحیح ہونے پر ایک ایسی دلیل ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک دُنیا میں غلط عقائد بھی قائم ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ان غلط عقائد کا حلقہ زمانی اور مکانی طور پر کسی قدر وسعت بھی حاصل کر لیتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں نظر آئے گا کہ کوئی غلط عقیدہ تمام دُنیا کے گوشہ گوشہ میں قائم ہو گیا ہو حتیٰ کہ کوئی ایک قوم بھی اس سے مستثنیٰ نظر نہ آتی ہو اور پھر کسی ایک زمانہ تک وہ محدود نہ رہا ہو بلکہ جب سے دنیا بنی ہو اسے یہی عالمگیر مقبولیت حاصل چلی آئی ہو۔ اگر ایسا ہو تو دنیا سے امان اُٹھ جاوے اور حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو جاوے۔ پس اس عقیدہ کی کہ اس دُنیا کے اوپر کوئی بالا ہستی ہے یہ عظیم الشان مقبولیت جو ہر قسم کے قیود زمانی اور مکانی سے آزاد ہے اور یہ شان دار ثبات جو تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ عقیدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دُنیا میں ایسے لوگ بھی تو ہوتے رہتے ہیں جو قطعاً کسی خدا کے قائل نہیں ہوتے تو اس کا یہ جواب ہے کہ بیشک ہر زمانہ میں ایسے لوگوں کا وجود پایا جانا رہا ہے لیکن ان لوگوں کو کبھی کسی زمانہ میں بھی مستقل طور پر قومی حیثیت حاصل نہیں ہوئی اور دہریت کا وجود کبھی بھی کسی قوم میں قومی عقیدہ کے طور پر بالاستقلال قائم نہیں ہوا اور نہ کبھی دہریت کا سلسلہ دُنیا میں ایک مستقل اور مسلسل سلسلہ کے طور پر جاری ہوا ہے۔ اور اس سے زیادہ وقعت اس عقیدہ کو کبھی حاصل نہیں ہوئی کہ چند آدمیوں کے دل و دماغ پر اسکی ایک عارضی حکومت قائم ہو جاوے اور بس۔ اقوام عالم کی تاریخ میں اس عقیدہ کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسا کہ کسی ملک کی منتظم اور قائم شدہ سلطنت کے سامنے چند ایسے باغیوں کی حیثیت ہوتی ہے جو گاہے گاہے بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے رہتے ہیں مگر کبھی بھی ایک لمبے عرصہ کے لئے جتھا

بنا کر حکومت کے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے اور نہ کبھی کسی علاقہ پر انکو کوئی مستقل اور مستحکم اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ کیا اس قسم کے باغیوں کی وجہ سے ملک کی قایم شدہ حکومت میں کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اس جگہ اگر کسی کو یہ شبہ گذرے کہ بعض مغربی مصنفین نے لکھا ہے کہ دُنیا میں بعض قومیں ایسی بھی گذری ہیں کہ جو بحیثیت قوم خدا کے عقیدہ سے بے بہرہ رہی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک بعض مصنفین نے ایسا لکھا ہے اور خصوصاً ابتدائی زمانہ کے متعلق ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بعض قومیں خدا کے عقیدہ سے بے بہرہ نظر آتی ہیں لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جاوے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان مصنفین کو دھوکا لگا ہے اور انہوں نے پوری تحقیق سے کام نہیں لیا۔ اور خصوصاً انکو یہ غلطی لگی ہے کہ انہوں نے بعض قدیم مشرک قوموں کے مشرکانہ عقائد کو محض خوف اور جہالت اور توہم پرستی کیطرف منسوب کر دیا ہے اور غلط طور پر یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا کا عقیدہ کبھی بھی انکے اندر پایا نہیں گیا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اور حق یہ ہے کہ شرک کا عقیدہ گو وہ جہالت کا نتیجہ ہی ہوتا ہے مگر وہ یقیناً خدا کے عقیدہ کی ایک فرع ہے یعنی مشرکانہ عقائد ہمیشہ ایمان باللہ کی بگڑی ہوئی حالت کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اور ایسا نہیں ہوتا کہ خدا کا عقیدہ بالکل مفقود ہونیکی صورت میں بھی شرک کے عقائد پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ تاریخ عالم میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک قوم پہلے خدا کے عقیدہ پر قائم نظر آتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں مشرکانہ خیالات کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ان مشرکانہ عقائد کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ خدا کا عقیدہ پس پشت ڈالا جاکر آہستہ آہستہ بالکل نظروں سے اوجھل اور بالآخر مفقود ہو جاتا ہے۔ پس جب ایسی مثالیں موجود ہیں تو انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ اوائل زمانہ کی جن اقوام میں ہمیں سوائے مشرکانہ عقائد کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور انکی ابتدائی تاریخ ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے انکے متعلق ہم یہی قیاس کریں کہ ابتداءً وہ خدا کے عقیدہ پر قائم ہونگی۔ لیکن آہستہ آہستہ خدا کا عقیدہ بالکل مفقود ہو گیا اور اسکی جگہ خالصتہً مشرکانہ خیالات قائم ہو گئے۔ دراصل جو مثالیں بعض لوگوں نے ہمارے اس خیال کے خلاف پیش کی ہیں وہ سب ایسی اقوام کی ہیں جنکی ابتدائی تاریخ محفوظ نہیں ہے اور

جب ابتدائی تاریخ محفوظ نہیں ہے تو دوسری واضح نظائر کو نظر انداز کر کے یہ خیال کر لینا کہ وہ قومیں ابتداء سے ہی مشرکانہ خیالات پر قایم رہی ہیں۔ اور یہ کہ ان کے مشرکانہ عقائد محض جہالت اور خوف اور توہم پرستی کا نتیجہ ہیں۔ اور خدا کا عقیدہ ان کے اندر کبھی بھی قایم نہیں ہُوا۔ ایک بالکل غیر منصفانہ استدلال ہے جسے کوئی غیر متعصب دانا شخص قبول نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں اگر نظرِ غور سے دیکھا جاوے تو مشرکانہ عقائد کبھی بھی محض جہالت اور خوف اور توہم پرستی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ اسکے لئے خدا کا عقیدہ پہلے موجود ہونا ضروری ہے۔ بیشک یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ جب ایک شخص کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور یا زیادہ مہیب یا زیادہ شاندار یا زیادہ نفع رساں ہوتی ہے تو وہ اسکے سامنے مرعوب ہو جاتا ہے اور اسکو ایک بڑی چیز سمجھنے لگ جاتا ہے اور اسکے سامنے دبتا اور خایف رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ شخص معبودیت کے تصوّر سے بالکل ناآشنا ہے تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ محض اس رعب یا خوف کی وجہ سے اسکو اپنا معبود بنا لے اور اس کو اپنا خالق و مالک یا کم از کم اپنی قسمت کا حاکم سمجھنے لگ جاوے۔ معبودیت کا خیال بہر حال اس بات کا متقاضی ہے کہ خیال کرنے والے شخص کے دماغ میں اس سے پہلے کوئی تصوّر معبودیت کا موجود ہو۔ خوب سوچ لو کہ انسانی تصوّر کبھی بھی خالق نہیں بن سکتا۔ ہاں البتہ نقال ضرور بن جاتا ہے یعنی اگر کسی انسان نے پہلے کوئی چیز دیکھی ہو یا سُنی ہو یا وہ اسکے تجربہ میں آئی ہو تو تب ضرور اس شخص کا تصوّر اسکے ذہن کے سامنے اس چیز کا نقشہ پیدا کر سکتا ہے لیکن اگر کوئی چیز کبھی دیکھی یا سُنی ہی نہ ہو تو اس صورت میں تصوّر ہرگز اس کا نقشہ ذہن میں نہیں پیدا کر سکتا۔ پس جب ہر قوم کے عقائد میں کسی نہ کسی صورت میں عابد و معبود کا مفہوم پایا جاتا ہے تو لامحالا اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر قوم اپنے اصل کے لحاظ سے خدا کے عقیدہ کو قبول کرتی ہے وھو المراد۔ اور اگر کسی کو یہ خیال گذرے کہ اس مضمون کے شروع میں تو بڑے زور شور کے ساتھ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ آجکل دنیا میں اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور ہر قوم دہریت کا شکار ہو رہی ہے اور یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تمام اقوام عالم خدا پر ایمان لاتی ہیں اور یہ قبولیت عامہ دہریت کو کبھی نصیب

نہیں ہوتی۔ گویا ان دونوں بیانوں میں تضاد ہے تو یہ شبہ قلت تدبّر کا نتیجہ ہوگا۔ کیونکہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ آجکل سب قومیں دہریت کا شکار ہو رہی ہیں وہاں حقیقی ایمان کو مدنظر رکھا گیا ہے اور موجودہ بحث میں صرف عقیدہ کے ایمان کا ذکر ہے۔ پس یہ دونوں بیان متضاد نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس زمانہ میں دُنیا کے اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے۔ کیونکہ جس قسم کا ایمان انکے اندر پایا جاتا ہے وہ کوئی زندہ حقیقت نہیں ہے جو عملاً انکی زندگیوں پر اثر پیدا کر سکے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ دُنیا کی ساری قومیں خدا پر ایمان لاتی رہی ہیں۔ کیونکہ گو ان کا ایمان کیسا ہی کمزور اور مُردہ بلکہ مشرکانہ ہو اس میں شک نہیں کہ وہ بحیثیت قوم عقیدۃً ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں اس ایمان پر قائم رہی ہیں کہ اس دُنیا کے اوپر کوئی خدا ہے جسکے قبضۂ تصرّف میں ہماری جانیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس جگہ صرف عقیدہ کے ایمان کا ذکر ہے باطنی حقیقت کی بحث نہیں۔ پس دونوں بیان اپنی اپنی جگہ سچے ہوئے اور تضاد کوئی نہیں رہا۔ خلاصہ کلام یہ کہ وہ عظیم الشان اور عالمگیر مقبولیت جو ایمان باللہ کے عقیدہ کو ہر زمانہ میں حاصل رہی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عقیدہ حق اور راستی پر مبنی ہے اور اسکے مقابل کا عقیدہ جو دہریت کے نام سے موسوم ہوتا ہے غلط اور باطل ہے۔ وھو المراد +

یقین کے مراتب

اگلی دلیل جو میں ہستی باریتعالیٰ کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں وہ دلیل بھی گو عقلی ہے اور **ہونا چاہیئے** والے مرتبہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن اہل بصیرت اس سے خدا تعالیٰ کی ذات کیطرف ایک یقینی اور قطعی اشارہ پا سکتے ہیں۔ دراصل یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ عقلی دلائل محض شکی دلائل ہیں اور ان سے کوئی مرتبہ یقین کا ذات باریتعالیٰ کے متعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ سمجھا ہے وہ بالکل غلط سمجھا ہے **ہونا چاہیئے** کا مرتبہ بھی ایک یقین کا مرتبہ ہے جس طرح **ہے** کا مرتبہ ایک یقین کا مرتبہ ہے فرق صرف یہ ہے کہ **ہونا چاہیئے** کے مرتبہ میں وہ یقین کامل حاصل نہیں ہو سکتا جو **ہے** کے مرتبہ میں حاصل ہوتا ہے اور وہ اطمینان اور تسکین کی صورت نہیں ہوتی جو **ہے** کے مقام پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہے ورنہ وہ بھی ایک یقین کا مقام ہے جس میں عقلمند آدمی کے واسطے کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ دراصل

یقین کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک یقین وہ ہے جو کسی چیز کے متعلق عقلی دلائل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور آثار کو دیکھ کر کسی چیز کے وجود پر دلیل پکڑی جاتی ہے۔ مثلاً ہم دُور سے ایک جنگل میں ایک خاص قسم کا دھواں اُٹھتا دیکھتے ہیں اور اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہاں ضرور کوئی آگ ہوگی جس سے یہ دھواں اُٹھتا ہے کیونکہ اس قسم کا دھواں بغیر آگ کے نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارا یہ استدلال ہم میں اس آگ کے وجود کے متعلق ایک عقلی یقین پیدا کر دیتا ہے۔ اس قسم کا یقین قرآن شریف کی اصطلاح میں **علم الیقین** کہلاتا ہے یعنی وہ یقین جو کسی علمی یا عقلی استدلال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور جس میں براہِ راست مشاہدہ کا دخل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ **ہونا چاہیئے** کا مرتبہ بھی اسی قسم کے یقین کا مرتبہ ہے کیونکہ اس میں بھی آثار سے ذات باریتعالیٰ کے وجود پر دلیل پکڑی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں **ہونا چاہیئے** اور **ہے** کے مرتبوں میں جو فرق ہے اسکو اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں کہ **ہونا چاہیئے** والے مرتبہ میں تو ہم خدا کی ذات پر دلائل کی مدد سے ایمان لاتے ہیں اور **ہے** والے مرتبہ میں دلائل کا واسطہ نہیں رہتا بلکہ مشاہدہ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر یقین کے باقی دو مراتب کا بھی ذکر کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا جو قرآن شریف نے بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مرتبہ جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے **علم الیقین** کا مرتبہ ہے۔ اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس میں آثار سے علمی استدلال کے طور پر ہم کسی چیز کے متعلق یقین حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ **عین الیقین** کا مرتبہ ہے اس میں استدلال کا واسطہ نہیں رہتا بلکہ مشاہدہ کی ابتداء شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہی آگ والی مثال لیکر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ جب ہم اس دھوئیں کی سمت میں چلتے چلتے آخر آگ کی روشنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر ہمیں اسکے متعلق صرف علم الیقین نہیں رہتا بلکہ **عین الیقین** حاصل ہو جاتا ہے یعنی ایسا یقین جو مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں استدلال کا دخل نہیں۔ اس مرتبہ کے اوپر ایک تیسرا مرتبہ ہے جسے قرآن شریف کی اصطلاح میں **حق الیقین** کہتے ہیں۔ یہ مقام انسان کو تب حاصل ہوتا ہے کہ جب وہ آگ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اسکی گرمی کو محسوس کرنے لگ جاتا ہے بالفاظ دیگر آگ کے اس طبعی اور ممتاز خاصہ کو جو گرمی کے نام سے

موسوم ہے خود اپنے نفس میں محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ آگ کی روشنی کو صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ قرب کی وجہ سے اس سے فائدہ بھی اُٹھاتا ہے اور صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کر سکتا ہے یہ وہ انتہائی مرتبہ یقین کا ہے جسکے اوپر کوئی اور مرتبہ نہیں ہے ہاں بیشک خود اس انتہائی مرتبہ کے اندر مختلف ماتحت مراتب کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور ہر شخص اپنی استعداد اور جدو جہد کے مطابق رتبہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس جگہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ الغرض یقین کے مختلف مراتب ہیں۔ اور ہونا چاہیئے والا مرتبہ جسکے متعلق اسوقت ہم بحث کر رہے ہیں ان مراتب میں سے ابتدائی مرتبہ ہے جسے علم الیقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے +

غلبۂ رسل کی دلیل

وہ دلیل ہستی باریتعالیٰ کی جو میں اسوقت پیش کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جب سے دنیا کی تاریخ محفوظ ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بھی خدا پر ایمان لانے والوں اور خدا کا انکار کرنے والوں کا (خواہ وہ انکار عقیدہ کا ہو یا عملی) مقابلہ ہوا ہے غلبہ ہمیشہ ایمان لانیوالوں کے ساتھ رہا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ ایمان لانیوالوں کی نصرت میں کوئی غیبی ہاتھ کام کرتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر قسم کے اختلاف میں مومن بہر حال کافر کے خلاف فتح پاتا ہے کیونکہ فتح و شکست قانون نیچر کے ماتحت آتی جاتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ایک کافر کامیابی کے طریق کو اختیار کرتا ہے اور ایک مومن نہیں کرتا۔ تو کافر کو فتح نصیب نہ ہو اور مومن کو ہو جاوے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا بلکہ کامیابی اسی کا حصہ رہیگی جو کامیابی کے رستے پر چلتا ہے خواہ وہ کوئی ہو۔ پس اس جگہ دنیا کے عام اختلافات اور مقابلے میرے مدنظر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب کبھی بھی کوئی راستباز شخص اس دعویٰ کے ساتھ دنیا میں کھڑا ہوتا ہے کہ خدا کیطرف سے میری زندگی کا یہ مشن مقرر کیا گیا ہے کہ میں ایمان کو دنیا میں قائم کروں۔ تو پھر وہ ضرور اپنے مشن میں کامیاب ہو کر رہتا ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت اسکی کامیابی کے رستہ میں روک نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہینگے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک رسول اکیلا اُٹھتا ہے اور مادی اسباب کے

لحاظ سے بھی گویا بالکل بے سرو سامان ہوتا ہے اور اسکے مخالفین اپنی تعداد کے لحاظ سے اور اپنے سامان کے لحاظ سے بظاہر ایسے نظر آتے ہیں کہ بس ایک آن کی آن میں اسے کچل کر رکھ دینگے لیکن اسکی فولادی میخیں آہستہ آہستہ لوگوں کے قلوب میں دھنستی چلی جاتی ہیں اور فتحمندی کا سہرا آخر اسی کے سر پر بندھتا ہے اور اسکے مخالف ذلیل و خوار ہو کر اپنا سا منہ لیکر رہجاتے ہیں۔ یہ نظارہ دنیا نے ایک دفعہ نہیں دیکھا دو دفعہ نہیں دیکھا دس بیس دفعہ نہیں دیکھا سو پچاس دفعہ نہیں دیکھا بلکہ ہزاروں دفعہ دیکھا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دنیا کی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس قسم کے مقابلہ میں دہریہ کو (دہریہ سے مُراد اس جگہ ہر وہ شخص ہے جو یا تو خدا کا بالکل ہی مُنکر ہے اور یا صرف رسمی طور پر خدا پر ایمان لاتا ہے اور حقیقتاً ایمان باللہ پر قائم نہیں) فتح نصیب ہوئی ہو۔ میرے عزیزو خوب غور کرو ایک جنگ ہے جو دُنیا کے مختلف حصّوں میں مختلف قوموں میں مختلف زمانوں میں مختلف حالات میں دس بیس دفعہ نہیں سینکڑوں دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ پیش آتی ہے اور ہر دفعہ ایک طرف خدا کا ایک بے یار و مددگار بے سرو سامان بندہ ہوتا ہے جو خدا کا نام لیکر کھڑا ہوتا ہے اور دوسری طرف دہریت کا عظیم الشان لاؤ لشکر ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ڈیرے ڈالے ہوتا ہے مگر جب جنگ شروع ہوتا ہے تو آخر میدان اسی خدا کے بندے کے ہاتھ رہتا ہے اور دہریت کی فوج کو اسیر ہو کر اسکے حلقہ بگوشوں میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق کا نتیجہ ہے؟ بھلا کوئی ایک مثال تو دو کہ اس قسم کی جنگ میں دہریت کی فوج نے فتح پائی ہو۔ اور خدا کے بندے کو ذلت کا مُنہ دیکھنا پڑا ہو؟ کیا یہ نظارہ اس بات کا یقینی ثبوت نہیں کہ خدا کا نام لیکر کھڑے ہونیوالوں کی مدد میں ایک قادر المطلق ہستی کا ہاتھ کام کرتا ہے جسکے مقابل میں دُنیا کے ساز و سامان ایک مُردہ کیڑے کی بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ آریہ ورت کے میدانوں میں حضرت کرشن اور رامچندر جی کے کارناموں کو دیکھو یہ بزرگ لوگ کس آواز کے ساتھ دنیا میں اُٹھے۔ اور ہندوستان کے نمکحرام فرزندوں نے اسکے ساتھ کیا سلوک کیا مگر آخر نتیجہ کیا نکلا؟ کیا آج آریہ ورت کی گردنیں ان مقدس ہستیوں کے سامنے جُھک کر اپنی غلامی کا اقرار نہیں کر رہیں؟ ابوالانبیا حضرت

ابراہیم کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالو۔ یہ خدا کا بندہ اکیلا تن تنہا شام کی تاریک وادیوں میں خدا کا نام لیکر کھڑا ہوتا ہے اور دہریت کے یہادر سپوت اس آواز پر اسکو جلتی ہوئی آگ کے مُنہ میں جھونک دیتے ہیں مگر وہ بظاہر بے یار و مددگار نوجوان ڈرتا نہیں خوف نہیں کھاتا۔ بلکہ اس طرح مزے سے تکبیر کے راگ گاتا چلا جاتا ہے جیسے کوئی پھولوں کی سیج پر آرام سے لیٹا ہوا ہو۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ ابراہیم کے کانوں میں کسی بالا ہستی کی یہ آواز گونج رہی تھی کہ اے ابراہیم آسمان کیطرف دیکھ۔ کیا تُو ان ستاروں کو گن سکتا ہے؟ ابراہیم عرض کرتا ہے اے میرے آقا تیرے لشکر کو کون شمار کر سکتا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے ابراہیم تو نے ہم سے محبت و وفا کا عہد باندھا ہے مجھے اپنی ذات کی قسم۔ تیری آل و اولاد بھی اسی طرح آسمانِ ہدایت پر ستارے بنکر چمکے گی اور گنی نہیں جائے گی۔" دیکھ لو آج دُنیا میں جتنے ابراہیم کے نام لیوا موجود ہیں اور کسی نبی کو میسر نہیں۔ مگر ابراہیم کو آگ میں ڈالنے والے کہاں ہیں؟ +

پھر حضرت موسیٰ کو لے لو۔ ایک غریب مفلس خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جسے اسکے گھر والے فرعون کے ڈر سے صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ فرعون کے لوگ اسے دریا سے اُٹھا لیتے ہیں اور رحم کے طور پر یا کسی اور خیال سے فرعون اسے اپنے گھر میں پالے جانے کا حکم دیتا ہے۔ یہ لڑکا جب بڑا ہوتا ہے تو سلطنت کے ایک جرم کی سزا سے خائف ہو کر وطن سے بھاگ نکلتا ہے اور جنگلوں کی خاک چھانتے ہوئے آخر ایک شخص کی خدمت اختیار کرتا ہے۔ جہاں دس سالہ خدمت کے بعد اسکی شادی ہوتی ہے۔ اور پھر وہ خدائی نور سے منوّر ہو کر فرعون کے دربار کیطرف واپس آتا ہے۔ اور سرِ دربار کھڑے ہو کر فرعون کے مُنہ پر کہتا ہے کہ میں اس خدا کا ایلچی ہوں جو تیرا اور میرا سب کا خدا ہے۔ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دے ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہو گا۔ فرعون اپنی حکومت کے نشے میں مخمور ہے تیوری چڑھا کر جواب دیتا ہے کہ اے موسیٰ کیا تُو میرے سامنے اس طرح بولتا ہے۔ ہاں تو جو میرے گھر کے ٹکڑوں پر پلا ہے ذرا ہوش میں آ کر بات کر۔ موسیٰ سمجھ جاتا ہے کہ اس بدمست دیو کا خمار یوں میں اُترتا نظر نہیں آتا۔ تجویز ہوتی ہے کہ کسی حکمتِ عملی سے خفیہ طور پر بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر

نکل چلیں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ فرعون کو علم ہوتا ہے تو غیظ و غضب میں اپنے آپ سے باہر ہوا جاتا ہے اور حکومت کے جرار لشکر کو ساتھ لیکر اس جنگل میں بھاگ نکلنے والوں کا تعاقب کرتا ہے اور بس دیکھتے کے دیکھتے انکو جالیتا ہے۔ بنو اسرائیل جنکو برسوں کی غلامی نے نامردوں سے بدتر بنا رکھا ہے یہ نظارہ دیکھ کر سہمے جاتے ہیں انکے عقب میں فرعون کا جرار لشکر ہے سامنے مہیب دریا ہے۔ گھبرا کر موسیٰ سے کہتے ہیں کہ موسیٰ اب کیا ہوگا؟ مگر موسیٰ ہے کہ چٹان کیطرح قائم ہے۔ ان سہمے ہوئے چہروں پر نظر ڈال کر کہتا ہے "کَلَّآ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ" خبردار گھبرانے کی کوئی بات نہیں میرے ساتھ میرا خدا ہے۔ دیکھو وہ ابھی تمہارے لئے رستہ بنائے دیتا ہے۔ اللہ اللہ یہ وہی موسیٰ ہے جو آج سے چند برس پہلے مصر کی پولیس سے ڈر کر وطن سے بھاگ نکلا تھا۔ اب فرعون کا لاؤ لشکر سامنے ہے اور ماتھے پر بل تک نہیں آتا! پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ موسیٰ کے لئے دریا پھٹکر رستہ کر دیتا ہے مگر فرعون معہ اپنے لشکر اور ساز و سامان کے دریا کی مہیب موجوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آج ابراہیم کیطرح موسیٰ کے نام لیوا ابھی شمار سے باہر ہیں اور فرعون کو کوئی جانتا تک نہیں۔ آؤ اب حضرت مسیح کا نظارہ کریں۔ بنو اسرائیل کی ایک غریب بے بیاہی لڑکی کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ بد باطن یہود چہ میگوئیاں کرتے ہیں کہ لڑکی تو کبھی بیاہی نہیں گئی یہ لڑکا کہاں سے آگیا۔ اور اسبات کو بھول جاتے ہیں کہ مسیح کی کم از کم ماں تو موجود ہے۔ حضرت آدم کا تو نہ باپ تھا نہ ماں۔ خیر یہ لڑکا بڑا ہوتا ہے اور پھر رُوح القدس سے تائید پاکر وہی پرانی آواز بلند کرتا ہے جو کرشنؑ نے ہندوستان میں اور ابراہیمؑ نے شام میں۔ اور موسیٰؑ نے مصر میں بلند کی تھی۔ مگر یہود جو پہلے سے ہی اسے کج آنکھوں سے دیکھ رہے تھے غیظ و غضب سے بھر جاتے ہیں اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا جاتا ہے اور یہود خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے میدان مار لیا۔ لیکن مسیح کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تھا وہ اپنے اس نام لیوا کی مدد کو آتا ہے اور اسے اس ذلت کی موت کے منہ سے نکال لیتا ہے۔ اور اپنے محبت کے کلام سے اسے یوں تسلی دیتا ہے کہ آج میری ایک مصلحت سے یہود نے تجھ پر ایک عارضی تسلط پا لیا ہے۔ لیکن میں تیرا وفادار آقا ہوں۔ اب قیامت تک یہ یہود تیرے حلقہ بگوشوں کے پاؤں

کے نیچے رہیں گے۔ اور دُنیا دیکھ لیگی کہ در اصل تونے فتح پائی ہے نہ کہ ان یہود نے" آج دنیا کیا نظارہ دیکھتی ہے؟ کیا مسیح کے خادم ساری دُنیا پر ایک سیل عظیم کیطرح نہیں چھا رہے ہیں؟ اور یہود کا کیا حال ہے؟ وُہی یہود جو ایک دن مسیح کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھتے تھے اور تمسخر کے ساتھ کہتے تھے کہ دیکھو یہ ہمارا بادشاہ ہے آج مسیح کے خادم رحم کھا کر انکے سروں پر ارض مقدس کی بادشاہت کا تاج اُٹھا اُٹھا کر رکھ رہے ہیں۔ مگر کوئی رکھنے نہیں دیتا۔ اللہ اللہ خدا کی بھی کیسی عبرتناک پکڑ ہے! +

پھر سب کے سردار محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کیطرف نگاہ کرو۔ قریش کے ایک معزز مگر غریب گھرانے کے لڑکے کی شادی ایک حیا پرور لڑکی سے ہوتی ہے۔ خاوند اور بیوی بہت تھوڑا عرصہ اکٹھا رہنا پاتے ہیں کہ اس لڑکی کے سر سے خاوند کا سایہ اُٹھ جاتا ہے۔ وہ لڑکی اسوقت حمل سے ہے اور اسکے پیٹ کا بچہ اسکے خاوند کی یاد کو اسکے معصوم دل میں اور بھی زیادہ دردناک طور پر تازہ رکھ رہا ہے۔ خیر وہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسے دیکھتی ہے اور گو اسوقت اسکے مرحوم خاوند کی یاد زیادہ درد و الم کے ساتھ اسکے دل میں تازہ ہو رہی ہے مگر وہ خوش بھی ہے کہ اسکے خاوند کے نام کو زندہ رکھنے والا بچہ اب اسکی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ اسے قریش کی رسم کے مطابق کسی بدوی دایہ کے سپرد کرنا چاہتی ہے مگر یتیم بچے کو کون لے۔ آخر بڑی تلاش کے بعد ایک دایہ ملتی ہے جو بچے کو اپنے ساتھ لیجانے پر رضامند ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ نبیوں کا سرتاج عرب کے صحرائی جھونپڑوں میں اپنی زندگی کے ابتدائی دن گذارتا ہے۔ جب ذرا عمر بڑی ہوتی ہے تو یہ بچہ اپنی ماں کے پاس آجاتا ہے مگر زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ ماں بھی عالم ارواح میں اپنے خاوند سے جاملتی ہے اور یہ بچہ بغیر ماں باپ کے رہجاتا ہے خیر رشتہ داروں کی آغوش تربیت میں یہ بچہ جوان ہوتا ہے اور دوسرے قریش کیطرح تجارت کے کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں اسکی عمر کے سال گذرتے جاتے ہیں وہ بالکل اَن پڑھ اور اُمّی ہے مگر اپنے اخلاق فاضلہ سے قوم میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ اسے امین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ جب اسکی عمر چالیس سال کے قریب ہوتی ہے تو اسکی طبیعت خلوت گزینی کیطرف مائل ہو جاتی ہے اور قریش کے عادات و رسوم اور

ان کا مذہب و ملت اسکی سادہ فطرت کو قابلِ نفرت نظر آتے ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ ضابطہ اخلاق اور دلکو تسکین دینے والے مذہب کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے۔ مکہ کے پاس ایک ویران پہاڑ ہے جس میں ایک ویران غار ہے یہ جگہ اسے اپنی خلوت نشینی کیلئے پسند آتی ہے اور وہ دن رات اسی کے اندر بیٹھا رہتا ہے اور ایک نامعلوم ہستی کی یاد میں جو اسکے بیچین دلکو تسکین دے سکے اپنا وقت گذارتا ہے۔ اس کا کوئی رازدار نہیں ہے مگر اسکی بوڑھی بیوی جو مکہ میں رہتی ہے اور اپنے خاوند کو پریشان دیکھ کر خود پریشان ہوئی جا رہی ہے۔ اس طرح وقت گذرتا جاتا ہے اور آخر وہ وقت آتا ہے کہ اس نامعلوم ہستی کی ضیا پاش کرنیں جسکی تلاش میں وہ سرگردان ہے اسکے قلب صافی پر گرنی شروع ہوتی ہیں۔ اور عالم روحانی کا وسیع منظر اسکی نیم باز آنکھوں کے سامنے کھلنا شروع ہوتا ہے اور مختصر یہ کہ زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ وہ اس پردہ مستور سے باہر آکر اپنے خداداد منصب کو قریش کے سامنے پیش کرتا ہے اور انکو اس خدا کیطرف بلاتا ہے جو اس دنیا کا خالق و مالک ہے اور جسکے بغیر اور کوئی خدا نہیں۔ سردارانِ قریش اسکی اس بات کو سنکر ہنس دیتے ہیں اور اسے قابل التفات نہیں سمجھتے۔ مگر وہ اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور آخر چند سمجھدار و فاشعار لوگ اسکے اِرد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اسکی باتوں پر ایمان لاکر اسکے کام میں ہاتھ بٹانے لگتے ہیں۔ اب اسکی قوم کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ یہ محسوس کرنے لگتی ہیں کہ یہ آواز صرف ہنسکر ٹال دینے والی نہیں بلکہ اگر اسکی روک تھام نہ کیگئی تو یہ انکی قوم میں پھوٹ اور جتھہ بندی پیدا کر دے گی۔ اور اب اس عظیم الشان اور تاریخ عالم میں بے نظیر مذھبی جنگ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس نے بیس سال تک عرب کے وسیع ملک میں ایک خطرناک زلزلہ اور طوفان برپا رکھا اور ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایک ایسی آگ لگادی جو اسوقت تک نہیں بجھی جب تک کہ سارا ملک ، ایک واحد خدا کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوگیا۔ سب سے پہلے قریش مکہ نے مسلمانوں کی اس مٹھی بھر جماعت کو جبرًا ان کے پرانے دین کیطرف لوٹانا چاہا۔ اور انکو ایسے ایسے مظالم کا تختہ مشق بنایا جن کا حال پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلال ایک حبشی غلام تھے انکے کانوں میں اسلام کی آواز پڑی تو فطرت صحیحہ نے فورًا قبول کر لیا۔ ان کا آقا امیہ بن خلف قریش کا ایک بڑا رئیس تھا اس

بدبخت نے انکو اتنے دکھ دیئے کہ خدا کی پناہ۔ دوپہر کے وقت جبکہ اوپر سے آگ برستی تھی اور مکہ کا پتھریلا میدان بھٹی کیطرح تپتا تھا۔ اُمیہ بن خلف انکو باہر لیجاتا اور انکو ننگا کرکے ریت پر لٹا دیتا اور بڑے بڑے گرم پتھر ان کے سینے پر رکھ کر خود اوپر چڑھ بیٹھتا اور کہتا "محمد سے الگ ہو جا۔ اور خدا کی پرستش ترک کر دے اور بتوں کے سامنے سجدہ کر۔ ورنہ اسی طرح عذاب دے دیکر مار دونگا" بلال رضؓ زیادہ عربی نہ جانتے تھے۔ آسمان کیطرف دیکھتے اور کہتے "احد احد" یعنی خدا ایک ہی ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر یہ ظالم انکو رسی سے باندھکر شریر لڑکوں کے حوالہ کر دیتا اور وہ انکو مکے کی گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے جس سے ان کا ننگا بدن زخمی ہو کر خون سے تر بتر ہو جاتا۔ اور اُمیہ پھر ان سے پوچھتا کہ بلال اب بتا کیا کہتا ہے؟ بلال رضؓ کے مُنہ سے پھر وہی آواز نکلتی کہ "احد احد" اور ظالم لڑکے پھر اُمیہ کا اشارہ پاکر انکو گھسیٹنا شروع کر دیتے۔ ایک اور مسلمان تھے جنکا نام **خباب** تھا۔ یہ غلام تھے بلکہ آزاد تھے اور مکہ میں لوہاری کی دوکان کرتے تھے۔ قریش کے شریر نوجوانوں نے غصہ میں آکر انکو انکی بھٹی کے دہکتے ہوئے کوئلوں کے اوپر لٹا دیا اور ایک شخص انکی چھاتی پر چڑھ بیٹھا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ حتیٰ کہ وہ کوئلے اسی طرح جل جل کر انکے نیچے ٹھنڈے ہو گئے مگر اس وفادار بندہ نے خدا کا دامن نہ چھوڑا۔ سمیہ ایک غریب مسلمان عورت تھی ابوجہل نے ان سے اصرار کیا کہ اسلام سے توبہ کرلیں مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر اس بدباطن نے انکی شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ یہ اس مذہبی جنگ کے ابتدائی کارناموں کی مثالیں ہیں جو قریشِ مکہ کیطرف سے غریب اور بے بس مسلمانوں کے خلاف وقوع میں آئے۔ خود مسلمانوں کے آقا اور سردار (فداہ نفسی) پر طائف کے شریر لوگوں نے پتھر برسا دئے۔ حتیٰ کہ آپؐ کا بدن سر سے لیکر پاؤں تک زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ اور آپؐ کے خون سے آپکی جوتیاں بھر گئیں آخر جب یہ مظالم انتہا کو پہنچ گئے اور بالآخر قریش نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب خواہ کچھ ہو محمد صلعم کو جان سے مار دینا چاہیئے تاکہ اس سلسلہ کا خاتمہ ہو تو آنحضرت صلعم مع اپنے چند ساتھیوں کے مکہ سے ہجرت کرکے یثرب چلے گئے تاکہ شاید اسی طرح قریش کا غصہ فرو ہو جاوے اور وہ مسلمانوں کو امن کے ساتھ زندگی بسر کرنے دیں اور انکی پُر امن تبلیغ میں روک نہ ہوں۔ مگر اس بات

نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھی بھڑکا دیا اور انکے رؤسا نے سارے ملک میں چکر لگا لگا کر تمام قبائل عرب کو مسلمانوں کے برخلاف اُکسانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ مسلمانونکی ایسی حالت ہوگئی جس طرح ایک شخص ایسے جنگل میں گھر جائے جسکے چاروں طرف صدہا میل تک آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں۔ چنانچہ ذیل کی تاریخی روایت مسلمانونکی اسوقت کی حالت کا نقشہ پیش کرتی ہے:۔ "جب محمد صلعم اور انکے اصحاب مدینہ میں آئے اور مدینہ کے بعض لوگوں نے انکو پناہ دی تو سارا عرب ایک جان ہو کر انکے خلاف اُٹھ کھڑا ہو۔ اسوقت مسلمانونکی یہ حالت تھی کہ راتکو ہتھیار لگا کر سوتے تھے اور دنکو بھی ہر وقت ہتھیار لگائے پھرتے تھے اس خیال سے کہ نہ معلوم کب کوئی دشمن انپر حملہ آور ہو جاوے۔ اور گھبرا گھبرا کر کہتے تھے کہ دیکھئے ہمیں بھی وہ دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں یا نہیں کہ جب ہم امن اور اطمینان کی نیند سو سکینگے۔ اور سوائے خدا کے ہمیں کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا" (ترجمہ از لباب النقول) اسوقت مسلمانونکی تعداد چند گنتی کے آدمیوں سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی عموماً حد درجہ غریب اور کمزور اور بے سروسامان تھے اور دوسری طرف انکے مقابل میں سارے ملک کی متحدہ طاقتیں اپنے بے انداز سروسامان سے جمع ہو کر ایک سیل عظیم کیطرح انڈی چلی آتی تھیں تا کہ اس مٹھی بھر جماعت کو جو خدا کا نام لیکر کھڑی ہوئی ہے ہمیشہ کے لئے صفحہ دُنیا سے میٹ دیں۔ اس بے نظیر جنگ میں جو جو قربانیاں آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کو کرنی پڑیں۔ اور جن جن مشکلات میں سے گذرنا پڑا۔ وہ ہر صحیح تاریخ میں مذکور ہیں اس جگہ انکے اعادہ کی ضرورت نہیں مگر ایک واقعہ ایسا ہے کہ جسے میں اس جگہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلعم ایک بڑی جماعت کے ساتھ حجاز کی ایک وادی میں سے گذر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک دشمن قبیلہ نے تیروں کی ایک باڑ ماری اور مسلمانوں کے حلیف اس غیر متوقعہ حملہ سے گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ بس پھر کیا تھا ساری اسلامی فوج میں اس قدر کھلبلی مچ گئی کہ اونٹ گھوڑے خچر۔ گدھے معہ اپنے سواروں کے مُنہ موڑ کر بے تحاشہ بھاگ نکلے۔ دشمن نے یہ نظارہ دیکھا تو شیروں کیطرح گرجتا ہؤا آگے بڑھا۔ اور بھاگتے ہوئے مسلمانوں پر تیروں کا مینہ برسانا شروع کر دیا۔ آنحضرت صلعم نے اپنے اِردگرد نظر ڈالی تو میدان صاف پایا۔ نہ مکے کے جدید نومسلم نظر آتے ہیں نہ مدینہ کے وفا شعار انصار۔ اور نہ پُرانے رفقاء مہاجر

اور اگر کوئی نظر آتا ہے تو صرف دشمن ہے جو ایک طوفانِ عظیم کیطرح سامنے سے امڈا چلا آتا ہے اور تیروں کی بارش ہے کہ الامان۔ مگر آپ بھی ہیں کہ پہاڑ کیطرح اپنی جگہ پر قایم ہیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ایک سہمے ہوئے ساتھی سے جو پاس کھڑا نظر آتا ہے فرماتے ہیں میرے گھوڑے کی لگام مضبوطی کے ساتھ تھام لے تاکہ یہ تیروں سے گھبرا کر پیچھے کیطرف مُنہ نہ موڑے اور پھر اپنے گھوڑے کو زور کے ساتھ ایڑ لگا کر یہ للکارتے ہوئے دشمن کیطرف آگے بڑھتے ہیں کہ "میں اللہ کا نبی ہوں۔ جھوٹا نہیں ہوں" نہ معلوم اس آواز میں کیا جادو بھرا تھا کہ جن جن مسلمانوں کے کانوں تک یہ آواز پہنچتی ہے وہ گرتے پڑتے مارتے کاٹتے پھر اپنے آقا کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ایک آن کی آن میں دشمن کی بڑھتی ہوئی صفوں کو بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ الغرض یہ جنگ ہوا۔ اور غارِ حرا کے اس خلوت پسند گوشہ گزین کو مدینہ میں پناہ لئے ابھی نو سال کا عرصہ نہ گذرا تھا کہ عرب کا وسیع ملک جو نو لاکھ مربع میل کے رقبہ پر مشتمل ہے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تکبیر کے نعروں سے گونجنے لگ گیا۔ کوئی کہے گا یہ تلوار کا کھیل ہے۔ میں کہتا ہوں تم بھی ایسا کھیل کر کے دکھادو۔ ایک اکیلا شخص غریب و ناتوان شخص۔ کمزور و بے سروسامان شخص اُٹھتا ہے۔ اور چند سال کے عرصہ میں ملک کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا ہے اور ملک بھی وہ ملک جو سر سے لیکر ایڑی تک اسکے خلاف ہتھیار بند تھا۔ کیا یہ تلوار کا کھیل ہے یا خدائے غیور کی قدرت نمائی کا کرشمہ؟ نادانو تلوار کس نے اُٹھائی؟ کیا تم میں سے کوئی ہے جو یہ ثابت کرسکے کہ تلوار کے اُٹھانے میں مسلمانوں نے ابتدا کی تھی؟ پھر کیا تم میں سے کوئی ہے جو یہ ثابت کرسکے کہ جب مسلمانوں نے خود حفاظتی یا قیام امن کے لئے تلوار اُٹھائی تو اسوقت بھی انہوں نے کسی ایک فرد واحد کو تلوار سے ڈرا کر مسلمان بنایا ہو؟ اے تاریکی کے بدقسمت فرزندو! میں تمہیں کس طرح یہ یقین دلاؤں کہ عرب نے خود مسلمانوں کے خلاف تلوار اُٹھائی اور اس نے صرف اس وقت اپنی تلوار واپس اپنے نیام میں ڈالی جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ محمد صلعم کے پیچھے کسی ایسی طاقتور ہستی کا ہاتھ ہے جسکے سامنے دنیا کے ساز و سامان ایک پرِ پشہ کی بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ پس بیشک انہوں نے ڈر کر اسلام کو قبول کیا لیکن تلوار سے ڈر کر نہیں بلکہ خدا سے ڈر کر۔ بیشک انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بتوں کو توڑا لیکن مسلمانوں کی طاقت کا خوف کھا کر نہیں

بلکہ خود ان بُتوں کو ذلیل و بے بس پاکر۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ عرب کے بعض رئیس خود اپنے پاؤں سے اپنے بُتوں کو ٹھکراتے تھے اور کہتے تھے "اگر اس حقیر چیز میں کچھ بھی طاقت ہوتی تو آج عرب کی متکبر گردنیں محمدؐ کے سامنے نہ جھکتیں" وہ لوگ جنکے ساتھ یہ ساری رام کہانی گذری ہے خود اپنے مُنہ سے تو یہ کہیں اور تم تیرہ سو سال بعد آنیوالے عرب کے ملک سے سینکڑوں ہزاروں میل پرے رہتے ہوئے اسلامی تاریخ سے جاہل مطلق یہ کہو کہ عرب نے محمد صلعم کی تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کیا تھا!!! تعصّب کا ستیاناس ہو۔ بے انصافی کی بھی کوئی حد ہے۔ الغرض آنحضرت صلعم کی یہ بے نظیر کامیابی اسبات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ آپکی نصرت میں ایک طاقتور ہستی کام کر رہی تھی۔ اور وہ وہی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں اور اب بھی جبکہ آپکی وفات پر تیرہ سو سال گذر چکا ہے چالیس کروڑ انسان آپکی غلامی کو اپنے لئے فخر سمجھتا ہے اور یہ حلقہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا ہے اور خدا کے فضل سے وہ وقت دُور نہیں کہ عالمِ روحانی کا یہ بے مثل تاجدار اپنے حُسنِ خداداد سے تمام دنیا کے قلوب پر حکومت کرے گا اور اسود و احمر کی گردنیں اس ظلّ اللہ کے سامنے محبت کی غلامی میں جُھکینگی۔ اللّٰھم صلّ علیہ وعلیٰ آلہ و بارک وسلم ؂

آنحضرت صلعم (فداہ نفسی) کے بعد آپ کے خادم ظلِّ کامل اور بروزِ جمالی حضرت مسیح موعود قادیانی علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی ذات والاصفات بھی اسی سلسلہ کی ایک مقدّس کڑی ہے۔ ایک گمنام ریل و تار سے دُور پردۂ تاریکی میں مستور گاؤں کے اندر ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ کے سایہ کے نیچے وہ بڑھتا ہے مگر خلوت پسند طبیعت کی وجہ سے اپنے گاؤں کی محدود سوسائٹی سے بھی الگ الگ رہتا ہے۔ باپ اپنی شفقت پدری کی وجہ سے کوشش کرتا ہے کہ کسی ملازمت پر اپنے اس بچہ کو فائز کرادے اور اسے پیغام بھیجتا ہے کہ فلاں اعلیٰ انگریز افسر میرے ساتھ خاص مہربانی کا تعلق رکھتا ہے اور وہ آجکل برسرِ اختیار ہے چلو میں اسے کہکر تمہارے واسطے معقول ملازمت کا انتظام کرادیتا ہوں۔ جواب آتا ہے کہ "آپ میرے لئے فکرمند نہ ہوں مُیں نے جہاں نوکر ہونا تھا ہو چکا ہوں" اور اب سے اس مقدّس نوکری کی داستان شروع ہوتی ہے جس نے آج مذہبی دنیا میں ایک زلزلہ اور طوفان برپا کر رکھا ہے۔ حضرت مرزا صاحب

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۸۸۴ء میں اپنا دعویٰ مجددیت دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ مگر چونکہ اس دعویٰ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو مسلمانوں کو خاص طور پر چونکانے کا موجب ہوتی اس لئے عموماً اسلامی دُنیا نے اس دعویٰ کو خاموش قبولیت یا کم از کم عدم انکار کی نظر سے دیکھا اور حضرت مرزا صاحب علیہ السلام بدستور اپنے منصب خدا داد کے مطابق اسلام کی تائید میں مصروف رہے اور مسلمان آپکی ان خدمات کو شکر و امتنان کی نظر سے دیکھتے رہے کیونکہ وہ آپکی خدمات کی وجہ سے محسوس کرتے تھے کہ اگر آج مسلمانوں کے اندر کوئی شخص اسبات کی اہلیت رکھتا ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں عزت اور کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے۔ تو وہ آپ ہی ہیں۔ مگر حضرت مرزا صاحب علیہ السلام کی ان خدمات نے مخالفین اسلام کے اندر عداوت اور دشمنی کی ایک خطرناک آگ مشتعل کر دی اور انہوں نے ہر ممکن طریق سے آپ کو نقصان پہنچانے اور ذلیل کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی اس حالت پر زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ حضرت مرزا صاحب علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے حکم پاکر مُلک میں اپنا یہ دعویٰ شائع کیا۔ کہ آخری زمانہ کے متعلق مسیح کے نزول اور مہدی کے ظہور کی جو پیشگوئی تھی اس کا مصداق میں ہوں۔ اور مسیح ناصریؑ علیہ السلام جنکی دوبارہ آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے فوت ہو چکے ہیں۔ بلکہ آپ نے یہ بھی دعویٰ فرمایا کہ دُنیا کے مختلف مذاہب میں جو آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں کہ ایک عظیم الشان مصلح کا ظہور ہوگا جو باطل کا مقابلہ کر کے اس کو مغلوب کر دے گا اور اسکے ہاتھ پر حق و صداقت کی فتح ہوگی وہ سب میری ذات میں پوری ہوتی ہیں اور میں ہی وہ موعود ہوں جس کا جملہ ادیان میں وعدہ دیا گیا تھا۔ اس دعویٰ نے جو طوفان بے تمیزی مخالفت کا برپا کیا اور جس طرح تمام مذاہب ایک جان ہو کر آپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ کیا مسلمان اور کیا عیسائی۔ کیا ہندو اور آریہ اور کیا سکھ پھر کیا برہمو اور کیا دیوسماج وغیرہ وغیرہ سب کے سب اپنے پورے زور کے ساتھ آپ کے خلاف ہاں ایک اکیلے بے سروسامان شخص کے خلاف میدان میں اُتر آئے۔ مسلمان علماء نے متفقہ طور پر آپ کو کافر ملحد ضال مضل بلکہ دجّال قرار دیا اور ایک باقاعدہ شرعی فتوے کے ذریعہ تمام اسلامی دُنیا میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ شخص اسلام سے خارج بلکہ اسلام کا بدترین دشمن ہے اور جو شخص اسکے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھے گا وہ بھی اسلام سے

خارج ہوجائے گا اور یہ بھی شائع کیا گیا کہ اس شخص کو ہر ممکن طریق سے نقصان پہنچانا نہ صرف جائز بلکہ کارِ ثواب ہے اور بعض نے تو یہاں تک فتویٰ دیا کہ اسلامی شریعت کی رو سے یہ شخص واجب القتل ہے اور اسکے قتل کرنیوالا ثوابِ عظیم کا حقدار ہے۔ اور اس قولی مخالفت کے علاوہ جو اپنے اثر کے لحاظ سے محض قولی نہ تھی بلکہ ملک میں ایک خطرناک آگ کے مشتعل کر دینے کا موجب ہوئی عملی طور پر بھی ہر جائز و ناجائز طریق سے آپکو مغلوب کرنے اور ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو وغیرہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوگئے سلسلہ احمدیہ کی ابتدائی تاریخ ایک دردناک کہانی ہے جسکے مطالعہ سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک طرف ایک اکیلا شخص ہے جسکے پاس بظاہر حالات کوئی جتھہ نہیں کوئی ساز و سامان نہیں کوئی مال و دولت نہیں کوئی علم و ہنر نہیں کوئی نام و نمود نہیں۔ دوسری طرف دُنیا بھر کی افواج ہر ممکن ساز و سامان سے آراستہ ایک سیلِ عظیم کیطرح چاروں طرف سے امڈی چلی آتی ہیں مگر وہ شخص ڈرتا نہیں۔ ہراساں نہیں ہوتا۔ ایک مستحکم چٹان کیطرح اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اسکے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں جسے چلائے کوئی مال نہیں جسے بکھیرے۔ کوئی علم نہیں جسکے ساتھ مرعوب کرے۔ کوئی طاقت نہیں جسکے ساتھ ڈرائے۔ ہاں صرف ایک جھنڈا ہے جسپر کسی غیر ارضی روشنائی میں لکھے ہوئے یہ الفاظ چمک رہے ہیں۔ "دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اسکو قبول نہ کیا لیکن خدا اسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اسکی سچائی ظاہر کر دیگا" اور جوں جوں دشمن کا حملہ خطرناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے توں توں وہ اس جھنڈا کو اپنے ہاتھوں میں بلند کرتا جاتا ہے اور نہ معلوم ان الفاظ میں کیا جادو بھرا ہے کہ دشمن کی افواج کے سپاہی ان الفاظ کو دیکھتے ہیں اور اپنی صفوں کو چھوڑ چھوڑ کر اس جھنڈے کیطرف کھچے چلے آتے ہیں۔ دشمن ان لوگوں کو ہر ممکن طریق سے تنگ کرتا ہے تمدنی سزائیں دیتا ہے انکے مال و دولت کو چھین لیتا ہے انکے بیوی بچوں کو ان سے جُدا کر دیتا ہے انکو مارتا ہے پیٹتا ہے قابو پاتا ہے تو قتل تک کر دینے سے دریغ نہیں کرتا مگر لوگ ہیں کہ بے خود سے ہوکر کھچے چلے آتے ہیں اور اپنی ظاہری آزادی کے تخت سے اُتر اُتر کر اس گاؤں کے رہنے والے بے یار و مددگار بے نام و نمود شخص کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں پہننے کے واسطے دوڑے چلے آتے ہیں۔

اللہ اللہ کیا نظارہ ہے۔ دشمن کہتا تھا کہ یہ ایک مچھر ہے جو اپنی بھنبھناہٹ سے ہمارے دماغ کو پریشان کر رہا ہے اگر یہ خاموش نہ ہوا تو ہم اسے اپنی انگلیوں میں لیکر مسل دینگے۔ مگر آج اسی "بھنبھنانے والے" کے نام لیوا دُنیا کے ہر قلعہ پر حملہ آور ہیں۔ اور دشمن بھی اسبات کا اقرار کرتا ہے کہ آج مذھبی دنیا میں کوئی طاقت ہے تو یہ ہے۔ کیا یہ کسی انسانی ہاتھ کا کام ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ انسانی ہاتھ کا کام اسباب کا محتاج ہوتا ہے مگر یہاں جتنے اسباب تھے وہ دشمن کے ہاتھ میں تھے اور حضرت مرزا صاحب علیہ السّلام کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا مگر باوجود دشمن کی انتہائی کوششوں کے حضرت مرزا صاحب کی فولادی مینخیں دُنیا کے قلوب میں دھنستی ہی چلی گئیں۔ اور جب آپکو خدا کیطرف سے پیغام وصال آیا تو چار لاکھ جان نثار و فاشعار خادم آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع تھا اور اب جبکہ آپکی وفات پر صرف سترہ سال گذرے ہیں آپکے نام لیوا دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی بے نظیر قربانیوں سے دُنیا کی نظروں کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ باتیں کوئی قصے کہانیاں نہیں بلکہ واقعات ہیں جنکو دشمن بھی اپنی عداوت اور تعصب کے پردے میں نہیں چھپا سکتا۔ ایک اکیلا شخص گمنام گاؤں کا رہنے والا شخص بے سروسامان شخص اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھے اپنے نام کا جلال قایم کرنیکے واسطے کھڑا کیا ہے۔ دُنیا اس کا انکار کرتی ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ اسکے خلاف میدان میں اُتر آتے ہیں اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں متوالے ہو کر سمجھتے ہیں کہ بس ہم ایک آن کی آن میں اسے صفحہ دنیا سے حرف غلط کیطرح میٹ کر رکھ دینگے۔ اسوقت جدھر دیکھو دشمن ہی دشمن ہیں اور دشمن بھی ایسے۔ کہ بس خون کے پیاسے اور اسکے مقابلہ میں اپنے سارے اختلافات کو بھولکر ایک جان ہو جانیوالے۔ اور ان میں سے ہر اک اسبات کا شایق ہے کہ سب سے پہلے وہی آگے بڑھ کر اپنا وار کرے۔ مگر وہ جسکو یہ لوگ ایک بھنبھنانے والا مچھر یا ایک پانی کا بلبلہ سمجھتے تھے وہ خدائے غیور کے ہاتھ کی ایک برہنہ تلوار تھی جسپر جو گرا وہ ہلاک ہوا۔ اور جو جس پر وہ گری۔ اسے اس نے ہلاک کیا۔ بڑے بڑے بہادر اس جری اللہ کے سامنے آئے مگر جس طرح بھٹی میں دانے بھنتے ہوئے چٹختے ہیں اس طرح اُڑ گئے۔ آخر یہ کیوں ہوا؟ سلسلہ احمدیہ کی ابتدائی حالت کیطرف دیکھو اور پھر

اس مخالفت کیطرف نگاہ کرو جو اسکے سامنے آئی۔ اور پھر اسکی موجودہ حالت کا مطالعہ کرو اور پھر انصاف سے کہو کہ کیا یہ کامیابی بغیر کسی غیبی نصرت و تائید کے ممکن تھی؟ ایک اکیلا بے سرو سامان شخص خدا کا نام لیکر اُٹھتا ہے اور باوجود دُنیا بھر کی شدید ترین مخالفت کے تیس پینتیس سال کے قلیل عرصہ کے اندر چار اکناف عالم میں اپنا تسلط اس طرح جما لیتا ہے کہ جس طرح گویا مذہبی دُنیا میں بس اسی کی حکومت ہے۔ ہندوستان میں احمدیوں کا مشن ہے۔ شام میں احمدیوں کا مشن ہے مصر میں احمدیوں کا مشن ہے۔ ایران میں احمدیوں کا مشن ہے بخارا میں احمدیوں کا مشن ہے۔ انگلستان میں احمدیوں کا مشن ہے امریکہ میں احمدیوں کا مشن ہے۔ افریقہ میں احمدیوں کا مشن ہے۔ ماریشس میں احمدیوں کا مشن ہے۔ جاوا سماٹرا میں احمدیوں کا مشن ہے آسٹریلیا میں احمدیوں کا مشن ہے اور یہ مشن سسکتے ہوئے جان توڑتے ہوئے دُشمن کے حملوں سے مغلوب مشن نہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ ایک طاقت ہیں جن کا لوہا دنیا مانتی ہے۔ او رلے وہ شخص جو جماعتِ احمدیہ کو کج آنکھوں سے دیکھتا اور اس حیرت انگیز ترقی پر غیظ و غضب میں آکر خون کے آنسو بہاتا ہے سُن رکھ کہ ابھی تو:۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ! آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

الغرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپکی جماعت کی کامیابی جن مخالف حالات میں اور جس سرعت کے ساتھ حیرت انگیز طور پر وقوع میں آرہی ہے وہ اسبات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ کوئی غیبی طاقت جو دنیا کی تمام طاقتوں پر غالب اور حکمران ہے آپکی تائید میں کام کر رہی ہے اور اسی کا نام ہم خدا رکھتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب سے کہ اس دنیا کی تاریخ محفوظ ہے ہمیشہ یہ نظارہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے آتا رہا ہے کہ جب کبھی بھی کوئی راستباز خدا کیطرف سے حکم پاکر خدا کے نام پر کھڑا ہوا ہے تو اسے خواہ کیسے ہی حالات پیش آئے ہیں وہ بالآخر غالب اور بامُراد ہو کر رہا ہے اور اسکے دشمنوں کو باوجود اپنی گوناگون طاقت اور بے اندازہ ساز و سامان کے ہمیشہ ذلت کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے اور یہ نظارہ جیسا کہ مینے اوپر بیان کیا ہے ایک دو دفعہ یا دس بیس دفعہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بلکہ ہزاروں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے اور دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک صحیح مثال بھی اسکے خلاف نظر نہیں آتی۔ پس یہ غلبہ اسبات کا ایک یقینی اور قطعی ثبوت ہے کہ خدا کے نام پر کھڑا

ہونے والونکی تائید میں کوئی زبردست غیبی طاقت کام کرتی ہے جسکے مقابل میں دُنیا کے ساز و سامان ایک مُردہ کیڑے کی بھی حقیقت نہیں رکھتے اور اسی کو ہم خدا کہتے ہیں جسکے آستانہ اُلوہیت پر ابن آدم کا جبینِ نیاز خم ہونا چاہیئے۔ کاش لوگ سمجھیں +

شہادت صالحین کی دلیل

آخری عقلی دلیل جو میں اس مضمون میں ہستی باریتعالیٰ کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں وہ شہادت صالحین سے تعلق رکھتی ہے یعنی اس اصول پر مبنی ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنکی راست گفتاری مسلّم ہے اور انکے صحیح الدماغ ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ اسبات کی ذاتی شہادت پیش کرتے ہیں کہ واقعی ہمارا ایک خدا ہے جسے ہمنے اسی طرح دیکھا اور پہچانا ہے جس طرح ہم دوسری چیزوں کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ ہر شخص جو تھوڑی بہت عقل اور تجربہ رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ حصول علم کے ذرائع میں سے شہادت بھی ایک بہت بڑا ذریعہ ہے بلکہ اگر ہم اپنے معلومات کے وسیع میدان پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے معلومات کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ جو ہمیں خود براہ راست حاصل نہیں ہوا بلکہ دوسرے معتبر لوگونکی روایت یا کتب صحیحہ کے مطالعہ یا اخبارات وغیرہ دیکھنے سے حاصل ہوا ہے اور ہمیں خود کبھی بھی اسے اپنے ذاتی مشاہدہ یا تجربہ میں لانے کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن باایں ہمہ ہمیں ان معلومات کے متعلق قریباً قریباً ایسا ہی پختہ یقین ہے جیسا کہ اپنے مشاہدہ یا تجربہ کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کے متعلق ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نہ ہو کیونکہ اگر ہم اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر یقین لاتے ہیں اور اسے قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک دوسرے شخص کے مشاہدہ اور تجربہ کو جو ہماری طرح ہی دل و دماغ رکھتا ہے اور جسکی راست گفتاری بھی شک و شبہ سے بالا ہے ہم قبول نہ کریں۔ اخبارات میں ہم دنیا بھر کی خبریں پڑھتے ہیں اور انکو صحیح مانتے ہیں۔ خواص الاشیاء کے متعلق جو جدید تحقیقاتیں ہو رہی ہیں اور جن سے دُنیا کے علوم میں گویا ایک نئے عالم کا دروازہ کھل رہا ہے انہیں ساری دنیا تسلیم کرتی ہے حالانکہ وہ لوگ جنہوں نے ان خواص کو اپنے تجربہ کے ذریعہ براہ راست محسوس کیا ہے بہت ہی تھوڑے ہیں پھر تمام دنیا کی فوجداری اور دیوانی عدالتوں کے فیصلے جات زیادہ تر زبانی یا تحریری شہادتوں کے ذریعہ ہی سرانجام پاتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ تاریخ کا علم بہت بڑی حد تک لوگونکی زبانی یا

تحریری شہادت پر مبنی ہے اور اسے سب تسلیم کرتے ہیں جغرافیہ کے علم کو لو تو ہندوستان کا بچہ بچہ یہ یقین رکھتا ہے کہ لنڈن ایک شہر ہے جو انگلستان کا دار السلطنت ہے حالانکہ ہندوستان کی آبادی کے ایک فیصدی حصہ نے بھی لنڈن کو نہیں دیکھا ہوگا مگر دوسروں کی شہادت کی وجہ سے سب مانتے ہیں۔ اسکے علاوہ ہم عملاً اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سی باتوں کو ہم صرف اس لئے مانتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے متعلق شہادت دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں خود انکے متعلق کوئی ذاتی علم حاصل نہیں ہوتا۔ الغرض شہادت علم کے حصول کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر اس سے انکار کیا جاوے تو بہت سے علوم دُنیا کے بیشتر حصہ کے واسطے باطل اور بیکار چلے جاتے ہیں کیونکہ اس انکار کے یہ معنی ہیں کہ لوگ صرف ان باتوں کو مانیں جو انکے ذاتی تجربہ یا مشاہدہ میں آچکی ہیں اور باقی سب کا انکار کردیں بلکہ اگر زیادہ غور سے دیکھیں تو شہادت کے اصل کا انکار کرکے ہم کسی علم کے بھی قایل نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اگر زید و بکر کا مشاہدہ اور تجربہ باوجود اسکے کہ وہ راستباز اور صحیح الدماغ ہیں اور انکے واسطے غلط بیانی کا کوئی محرک بھی نہیں ہے قابل تسلیم نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا اپنا مشاہدہ اور تجربہ خود ہمارے واسطے قابل تسلیم ہو۔ اگر وہ اپنے مشاہدہ میں غلطی کر سکتے ہیں تو ہم بھی تو غلطی کے ارتکاب سے بالا نہیں ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ شہادت کے اصل کا انکار کرنے کے سوائے اسکے کہ توہم پرستی کا دروازہ کھول دیا جاوے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بعض اوقات شہادت غلط بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات گواہ دروغ گو تو نہیں ہوتا۔ لیکن بوجہ ناقص الفہم ہونے کے اسکی شہادت قابل قبول نہیں رہتی۔ یہ درست ہے اور ہم اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن اس احتمال کی وجہ سے شہادت کا دروازہ حصول علم کے واسطے ہرگز بند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی خراب اور بوسیدہ دوائی کے استعمال سے کسی مریض کو نقصان پہنچ جاوے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوائی اپنی ذات میں غیر مفید اور ضرر رسان ہے؟ اسی طرح جھوٹے اور ناقص الفہم شاہد کی شہادت سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ شہادت کا اصول ہی باطل ہے۔ اس سے تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح ایک خراب شدہ دوائی کے استعمال سے پرہیز لازم ہے اسی طرح ایک دروغگو یا ناقص الفہم شخص کی شہادت کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا

چاہیئے جیسا کہ قرآن شریف بھی فرماتا ہے ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا (حجرات) یعنی اگر تمہارے پاس کوئی جھوٹا شخص ایک خبر لاتا ہے تو اسے یونہی بلا تحقیق نہ مان لیا کرو بلکہ تحقیق کے بعد اگر درست ثابت ہو تو تب مانا کرو۔ الغرض شہادت حصول علم کے ذرائع میں سے ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور صرف اس احتمال سے کہ بعض شہادتیں غلط بھی ہو سکتی ہیں اس ذریعہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر اس قسم کے احتمالات سے کسی چیز کو باطل قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر دُنیا کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں رہتی کہ جو قابل تسلیم ہو سکے۔ کیونکہ ہر چیز کے متعلق خواہ وہ کیسی ہی یقینی ہو اس قسم کے احتمالات کا دروازہ کھلا ہے۔ خوراک انسان کی بھوک کو دُور کرتی اور اسکے جسم کی ترقی اور بحالی کا موجب ہے لیکن کیا خوراک بعض اوقات گندی اور خراب نہیں ہوتی جو بجائے جسم کے لئے مفید ہونیکے اُسے اُلٹا نقصان پہنچا دیتی ہے مگر کیا کوئی ہے جو اس احتمال کی وجہ سے یہ نتیجہ نکالے کہ خوراک جسم انسانی کے لئے ضرر رساں ہے؟ بات یہ ہے کہ ہر چیز خواہ وہ کیسی ہی مفید اور فائدہ مند ہو غلط ہاتھوں میں جاکر اور غلط استعمال میں آکر نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ پس ضرورت صرف اس احتیاط کی ہے کہ کسی چیز کا غلط استعمال نہ ہو۔ اور اصول شہادت کا غلط استعمال یہ ہے کہ کسی دروغگو یا ناقص الفہم اور مخبوط الحواس شخص کی شہادت پر کسی فیصلہ کی بنا رکھ دی جاوے پس اگر ہم اس غلط استعمال سے اپنے آپکو محفوظ رکھتے ہیں تو پھر شہادت ایک نہایت مفید اور قابل اعتماد ذریعہ حصول علم کا قرار پاتا ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ **وھو المراد**۔

مذکورہ بالا اصول کے ماتحت ہم ہستی باریتعالیٰ کے عقیدہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ عقیدہ دُنیا کی مضبوط ترین شہادت سے پایۂ ثبوت کو پہنچا ہُوا نظر آتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک یا کسی قوم یا کسی زمانہ میں مبعوث ہوئے ہوں، ہمارے سامنے یہ شہادت پیش کرتے ہیں کہ دُنیا کا ایک خدا ہے جو اس تمام کارخانہ عالم کا خالق و مالک و متصرف ہے اور وہ محض کسی خیال یا سُنی سنائی بات کی بنا پر ایسا نہیں کہتے بلکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے اس خدا کو اسی طرح دیکھا اور پہچانا ہے جس طرح ہم دنیا کی چیزوں کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں اور اس خدا کے ساتھ ہمارے ذاتی تعلقات ہیں اور ہم اسکی ہستی کے متعلق ایسا ہی یقین رکھتے

ہیں جیسا کہ مثلاً ہمیں یہ یقین ہے کہ فلاں شخص ہمارا باپ ہے اور فلاں ہماری ماں ہے اور فلاں ہمارے بھائی اور بہن ہیں اور فلاں ہمارے دوست ہیں اور فلاں ہمارا شہر ہے اور فلاں ہمارا مکان ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ ہم سے کلام کرتا ہے اور ہماری باتوں کو سنتا اور ان کا جواب دیتا ہے اور ضرورت کے وقت ہماری نصرت فرماتا ہے۔ الغرض انبیاء اور رسل نہایت واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں ہمارے سامنے اس شہادت کو پیش کرتے ہیں اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے انکی شہادت کسی سُنی سنائی بات پر مبنی نہیں بلکہ انکے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے اور کسی ایک ملک یا ایک قوم یا ایک زمانہ تک محدود نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے آدم ہے تو اس کا شاہد ہے نوح ہے تو اس کا شاہد ہے یونس و ایوب ہیں تو اسکے شاہد ہیں ابراہیم و لوط ہیں تو اسکے شاہد ہیں اسماعیل و اسحاق ہیں تو اسکے شاہد ہیں یعقوب و یوسف ہیں تو اسکے شاہد ہیں موسیٰ و ہارون ہیں تو اسکے شاہد ہیں سلیمان و داؤد ہیں تو اسکے شاہد ہیں ذکریا و یحییٰ ہیں تو اسکے شاہد ہیں مسیح ہے تو اس کا شاہد ہے پھر زرتشت ہے تو اس کا شاہد ہے کنفیوشس ہے تو اس کا شاہد ہے کرشن و رامچندر ہیں تو اسکے شاہد ہیں پھر حضرت محمد مصطفےٰ صلعم ہیں تو اس کے شاہد ہیں اور اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود ہیں تو اسکے شاہد ہیں۔ اور انکے علاوہ بھی جتنے بانیانِ مذہب گذرے ہیں سب اس معاملہ میں اپنی ذاتی شہادت ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ دنیا ایک خالق و مالک قدیر و متصرف خدا کے ماتحت ہے جسکے قبضۂ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنکی راست گفتاری اور دیانت و امانت دوست و دشمن میں مسلّم ہے یعنی دشمن بھی اسبات کو مانتا ہے کہ خواہ ان کا لایا ہوا مذہب ہم قبول کریں یا نہ کریں لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ سب لوگ اپنی ذات میں راستباز اور صادق القول ہیں۔ اور پھر یہ لوگ مجنون یا ناقص الفہم یا مخبوط الحواس بھی نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جو دل و دماغ کی اعلیٰ ترین طاقتیں لے کر دُنیا میں آئے ہیں۔ اندریں حالات ان لوگوں کی شہادت اہل بصیرت کے نزدیک وہ وزن رکھتی ہے جو کسی اور شہادت کو حاصل نہیں ہو سکتا میرے عزیزو خوب سوچو اور غور کرو کہ دنیا کے مختلف حصّوں میں مختلف قوموں میں مختلف زمانوں میں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنکی راست گفتاری اور دیانت و امانت ہر قسم کے

شک و شبہ کے احتمال سے بالا ہے اور انکی دماغی حالت بھی پوری طرح صحیح اور تمام نقصوں سے پاک سمجھی گئی ہے بلکہ وہ اپنی بےمثل راست گفتاری اور اعلیٰ دماغی طاقتوں میں دوسروں کے واسطے ایک نمونہ سمجھے جاتے ہیں اور یہ لوگ تعداد میں بھی دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ ہزاروں ہیں اور مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب لوگ دُنیا کے سامنے اپنی ذاتی شہادت پیش کرتے ہیں کہ یہ دُنیا و مافیہا ایک بالا ہستی کے قبضہ تصرّف میں ہے اور یہ کہ ہم نے اس بالا ہستی کو اسی طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے جس طرح ہم دوسری چیزوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور اسکے ساتھ ہمارے اسی طرح کے تعلقات ہیں جس طرح ہم اس دُنیا کی محسوس و مشہود چیزوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں۔ کیا یہ شہادت اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جاوے۔ اگر یہ شہادت قابل قبول نہیں تو دنیا میں کوئی شہادت بھی ایسی نہیں ہوسکتی جو قابلِ قبول ہو۔ دو ہی باتیں ہیں جو کسی شہادت کے متعلق شبہ پیدا کر سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ شاہد کی راست گفتاری مشتبہ ہو۔ دوسرے یہ کہ شاہد ناقص الفہم ہو کیونکہ اس سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ گو وہ دیدہ دانستہ جھوٹ نہ بولے لیکن بوجہ ناقص الفہم ہونیکے اسکے مشاہدہ اور تجربہ میں غلطی واقع ہوسکتی ہے لیکن یہاں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں اور نہ صرف مفقود ہیں بلکہ یہ شاہد وہ ہیں جو اپنی صادق القولی اور اعلیٰ دماغی طاقتوں میں دنیا کی صف اوّل میں شمار کئے گئے ہیں اور پھر وہ شہادت بھی کوئی سماعی شہادت پیش نہیں کرتے بلکہ اپنا ذاتی اور عینی مشاہدہ پیش کرتے ہیں اور یہ لوگ گذرے بھی مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جنکو اپنے زمانہ میں دوسروں کے وجود تک اطلاع نہ تھی۔ اندریں حالات انکی یہ شہادت ایسی وزن دار شہادت ہے کہ جو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیجاسکتی۔ یُوں سمجھو کہ تمہارے پاس ایک مقدمہ آتا ہے اور تم نے اس کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایک طرف ہزاروں انسانوں کی جماعت ہے جنکے ایک ایک فرد کی راست گفتاری اور صحیح الدماغی دوست و دشمن میں مسلّم ہے اور یہ لوگ الگ الگ اپنی عینی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو فلاں جگہ دیکھا ہے اور دوسری طرف ایک گروہ ہے جس میں ہر قسم کے بُرے بھلے لوگ شامل ہیں اور وہ یہ بیان دیتے ہیں کہ ہم نے اس شخص کو نہیں دیکھا۔ بتاؤ تم کس فریق کے حق میں فیصلہ دوگے؟ اگر تم اپنے اندر فیصلہ کی طاقت نہیں پاتے تو کسی قانون دان سے جاکر پوچھو

وہ تمہیں بتائے گا کہ اگر دیکھنے والوں کی شہادت شبہ سے بالا ہے تو اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا اور نہ دیکھنے والوں کا بیان خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی زیادہ ہوں فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پیدا کرسکے گا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک چیز موجود ہو اور بعض لوگ اسے نہ دیکھیں لیکن یہ محال ہے کہ ایک چیز موجود نہ ہو اور عاقل اور صحیح الدماغ شخصوں کی ایک جماعت اسے دیکھ لے۔ الغرض انبیاء و رسل کی شہادت جو وہ ہستی باریتعالٰی کے متعلق پیش کرتے ہیں اسبات کا ایک نہایت زبردست ثبوت ہے کہ واقعی ہمارا ایک خدا موجود ہے۔ اور اگر انبیاء اور رسل کے ساتھ ان کے متبعین میں سے صلحاء اور اولیا کو بھی شامل کرلیا جاوے تو پھر یہ شہادت ایسی وزن دار ہو جاتی ہے کہ اس کا انکار قریبًا جنون کے حکم میں آجاتا ہے۔ ہر اُمّت میں لاکھوں صلحاء اور اولیاء گذرے ہیں جو اپنے اپنے حلقہ میں اپنی بزرگی اور عقل و دانش کی وجہ سے لوگوں کے قلوب پر حکومت کرتے رہے ہیں اور انکی راست گفتاری اور امانت و دیانت لوگوں کے واسطے نمونہ رہی ہے یہ لوگ بھی اسبات کی شہادت دیتے رہے ہیں کہ دُنیا کا ایک خدا ہے جسکے قبضۂ تصرف کے ماتحت یہ سارا کارخانہ عالم چل رہا ہے اور یہ شہادت بھی کوئی سُنی سنائی شہادت نہیں بلکہ انبیاء کیطرح ان لوگوں کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے پس جبتک یہ ثابت نہ کیا جاوے کہ یہ لاکھوں بلکہ کروڑوں انبیاء و اولیاء جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں ظاہر ہوتے رہے ہیں نعوذ باللہ دروغگو یا مخبوط الحواس اور ناقص العقل تھے اسوقت تک ان لوگوں کی یہ عظیم الشّان شہادت کہ ہم نے خدا کو دیکھا اور پہچانا ہے اور اسکے ساتھ ہمارا ذاتی تعلّق قائم ہے ایک ایسا گراں پتھر ہے جسے کوئی دہریہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ کیا کوئی دہریہ یہ جرأت کرسکتا ہے کہ مرد میدان بنکر دنیا کے سامنے آئے اور اسبات کو ثابت کرے کہ حضرت ابراہیمؑ دروغگو تھے یا مجنون تھے حضرت موسٰی دروغگو تھے یا مجنون تھے۔ حضرت مسیحؑ دروغگو تھے یا مجنون تھے۔ حضرت کرشن دروغگو تھے یا مجنون تھے زرتشت دروغگو تھے یا مجنون تھے۔ آنحضرت صلعم دروغگو تھے یا مجنون تھے حضرت مسیح موعود دروغگو تھے یا مجنون تھے اور اسی طرح باقی تمام انبیاء بھی دروغگو تھے یا مجنون تھے۔ اور یہ جو ہر امت میں بیشمار صلحاء اور اولیا گذرے ہیں یہ بھی سب دروغگو تھے یا مجنون تھے؟ اور اگر کوئی دہریہ یہ ثابت نہیں کرسکتا تو کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ تم لنڈن کو باوجود نہ

دیکھنے کے مانو کیونکہ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ لنڈن ایک شہر ہے اور قطب شمالی اور جنوبی کو باوجود نہ دیکھنے کے مانو کیونکہ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ موجود ہیں اور دوسرے ممالک کے واقعات کو جو اخباروں میں چھپتے ہیں باوجود خود نہ دیکھنے کے مانو۔ کیونکہ رائٹر یا ہواس یا کوئی اور ایجنسی کہتی ہے کہ وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں اور سائنس کی جدید تحقیقاتوں کو باوجود خود تجربہ نہ کرنے کے مانو کیونکہ تجربہ کرنیوالے کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہیں۔ مگر خدا کو باوجود اسکے کہ لاکھوں صحیح الدّماغ راستباز اس کے موجود ہونیکی ذاتی شہادت پیش کرتے ہیں تسلیم نہ کرو! تلك اذاً قسمة ضيزٰی۔ اور اگر کہو کہ یہ باتیں جو دوسرے لوگ پیش کرتے ہیں یہ گو ہم نے خود نہیں دیکھیں لیکن ان کے دیکھنے اور مشاہدہ کرنیکا رستہ تو ہمارے واسطے کھلا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ناداں تو خدا تمہاری آنکھیں کھولے یہ رستہ تمہارے لئے خدا کے متعلق بھی کھلا ہے بلکہ جو لوگ خدا تک پہنچنے کے مدعی ہیں وہ خود یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر تم اس طریق کو اختیار کرو جو ہم تمہیں بتاتے ہیں اور جو خدا تک پہنچنے کا طریق ہے تو تم بھی ہماری طرح خدا کو مل سکتے اور اسکے ساتھ تعلق پیدا کر سکتے ہو اور یہ ان کا خالی دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ بیشمار لوگوں نے انکی اتباع اختیار کرکے واقعی خدا کا عرفان حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے چاہو تو آزما دیکھو۔ مگر افسوس کہ دنیا کے مقاصد کے متعلق تو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے حصول کا ایک معین طریق ہے جسے اختیار کئے بغیر وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور ہر مقصد کا حصول وقت بھی چاہتا ہے۔ لیکن روحانی مقاصد کے متعلق یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ صرف خواہش کرنے سے ہی فوراً حاصل ہو جایا کریں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر عقل رکھتے ہو تو سوچو کہ ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔ حق یہی ہے چاہو تو قبول کرو کہ ہر مقصد کے حصول کے واسطے خواہ وہ مادی ہے یا روحانی۔ ایک خاص طریق مقرر ہے اور جبتک انسان اس طریق کو اختیار نہ کرے وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ جتنا بڑا اور جتنا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اتنا ہی اسکے واسطے زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے زیادہ محنت اٹھانی پڑتی ہے زیادہ قربانی کرنی پڑتی ہے زیادہ لمبے ضابطۂ عمل میں سے گذرنا پڑتا ہے تب جاکر وہ مقصد حاصل ہوتا ہے مگر تم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بغیر کچھ کئے کے یہ امید رکھتے ہو کہ اگر کوئی خدا ہے تو وہ تمہیں مل جاوے۔ خدا کی قسم تم اس طرح

خدا کو کبھی نہیں پاؤ گے۔ ہاں سچی تڑپ اور دلی آرزو اور پوری توجہ اور واجبی محنت کے ساتھ اس طریق کو اختیار کرو جو خدا تک پہنچنے کا طریق ہے اور پھر اگر خدا کو نہ پاؤ تو تب یہ کہتے ہوئے بھلے لگو گے کہ ہم نے خدا کو تلاش کیا مگر نہ پایا۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ تم ٹھیک راستہ پر چل کر خدا کو تلاش کرو اور پھر خدا تمہیں نہ ملے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے جو تمہاری طرح کے انسان تھے اور تمہاری طرح کا دل و دماغ رکھتے تھے خدا کو تلاش کیا اور آخر اسکو پالیا اور تاریخ عالم کے صفحات پر ان لوگوں کی شہادت ہاں ذاتی اور عینی شہادت واضح اور غیر مشکوک شہادت ثبت ہے اور تم میں سے کوئی شخص یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ انکی شہادت کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ کا احتمال پیدا کرسکے۔ تم ان کو دھوکا باز نہیں کہہ سکتے تم انکو ناقص العقل اور مخبوط الحواس نہیں کہہ سکتے۔ تم انکے متعلق یہ شبہ نہیں کرسکتے کہ انہوں نے باہم ملکر ایک بات بنالی ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ تم انکی شہادت کو محض اپنے دماغ کے فرضی تخیلات کی بنا پر رد کردو۔

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم ان لوگوں کو دھوکے باز یا ناقص العقل نہیں کہتے بلکہ دھوکا خوردہ کہتے ہیں اور دھوکا ہر انسان کو کم و بیش لگ سکتا ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ بیشک اسبات کا امکان ہے کہ ایک فہمیدہ آدمی کو بھی کبھی دھوکا لگ جاوے۔ لیکن کسی بات کے امکان ہونیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بات عملاً وقوع میں بھی آگئی ہے یعنی صرف اتنی بات کہدینے سے کہ دھوکا لگ جانے کا امکان ہے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ واقعی دھوکا لگا بھی ہے۔ پس جبتک یہ ثابت نہ کیا جاوے کہ یہ سب لوگ اس معاملہ میں واقعی دھوکا خوردہ تھے۔ اسوقت تک محض دھوکا لگنے کا امکان بیان کردینے سے معترض کا مطلب حل نہیں ہو سکتا۔ وہ کونسی بات ہے جس میں دھوکے کا امکان نہیں ہے تو کیا اس وجہ سے دنیا کی ساری باتوں کو مشکوک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو توہم پرستی کا ایسا دروازہ کھل جاتا ہے کہ کوئی بات بھی یقینی نہیں رہتی۔ پس جو شخص اسبات کا مدعی بنتا ہے کہ یہ شہادت دینے والے سب کے سب بلا استثناء اس معاملہ میں دھوکا خوردہ ہیں اس کا یہ فرض ہے کہ اپنے اس دعویٰ کو دلائل کے ساتھ ثابت کرکے دکھائے۔ والا صرف منہ کی پھونکوں سے لاکھوں راستباز صحیح الدماغ بزرگوں کی شہادت کو اڑا دینے کی کوشش کرنا ایک طفلانہ

فعل ہے جسکی طرف کوئی عقلمند توجہ نہیں کر سکتا۔ شہادت دینے والوں نے شہادت دی ہے اور واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں دی ہے اور کوئی سُنی سنائی شہادت نہیں دی بلکہ اپنا ذاتی اور عینی مشاہدہ پیش کیا ہے اور یہ شہادت دینے والے راستباز اور صحیح الدّماغ انسان ہیں اور پھر تعداد میں بھی وہ کم از کم لاکھوں ہیں اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں صرف اتنا کہدینے سے کہ دھوکا لگنے کا امکان ہے یہ سمجھ لینا کہ بس یہ شہادت مشکوک ہو گئی ہے ایک مجنونانہ فعل ہے جسپر کوئی دل و دماغ رکھنے والا انسان تسلّی نہیں پا سکتا۔

دوسرا جواب جو اس اعتراض کا میں دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دھوکا لگنے کے بھی موقعے اور حالات ہوتے ہیں اور ہر جگہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دھوکا لگا ہو گا۔ ایک عاقل اور صحیح الدّماغ شخص کے لئے دھوکا لگنے کا امکان صرف ان صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ جہاں رائے اور خیال کا دخل ہو اور دلائل کی بنا پر فیصلہ کرنا ہو مثلاً ایک علمی مسئلہ میں یہ امکان ہے کہ دو شخص دو مختلف خیال رکھتے ہوں اور دونوں صحیح الدّماغ ہوں کیونکہ جہاں رائے اور استدلال کا دخل ہے وہاں اس بات کا امکان ہے کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے غلطی لگ جاوے لیکن جہاں مشاہدہ کا سوال ہے وہاں ایک صحیح الدّماغ شخص کے واسطے دھوکے کا امکان نہیں رہتا خصوصاً جبکہ وہ مشاہدہ ایسی چیز سے تعلّق رکھتا ہو جسکے متعلق وہ شخص یہ دعویٰ رکھتا ہے کہ وہ اسکی خاص دلچسپی کی چیز ہے اور دن رات اسکے سامنے رہتی ہے۔ اگر ایسی حالت میں بھی ایک صحیح الدّماغ شخص کے واسطے دھوکا لگنے کا امکان تسلیم کیا جاوے تو پھر خطرناک توہم پرستی کا دروازہ کھُل جاتا ہے اور دُنیا سے امن اُٹھ جاتا ہے اور کوئی مشاہدہ بھی یقینی نہیں رہتا۔ کیا کسی صحیح الدّماغ شخص کو یہ دھوکا لگ سکتا ہے کہ وہ کسی غیر اور اجنبی شخص کے متعلق یہ سمجھنے لگ جاوے کہ یہ شخص میرا فلاں دوست ہے جسکے ساتھ اتنے سالوں سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں یا ایک ناواقف شخص کو اپنا باپ یا بھائی سمجھنے لگ جاوے؟۔ ظاہر ہے کہ ایسا دھوکا سوائے ایک مجنون یا مخبوط الحواس شخص کے اور کسی کو نہیں لگ سکتا۔ اب اس اصل کے ماتحت ہم انبیاء و صلحا کی شہادت پر نظر ڈالتے ہیں تو انکی شہادت بھی دھوکا لگنے کے امکان سے بالا تسلیم کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم نے عقلی دلائل سے خدا کی ہستی پر اطلاع پالی ہے اور بس۔ بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے

واقعی خدا کو پا لیا ہے اور اسکے ساتھ ہمارا ذاتی تعلق قائم ہو گیا ہے اور وہ ہم سے کلام کرتا اور ہماری باتوںکو سُنتا اور ان کا جواب دیتا ہے اور ضرورت کے وقت اپنی زبردست طاقتوں کے ساتھ ہماری نصرت فرماتا ہے اور پھر وہ اپنے اس مشاہدہ کو اپنی عمر کے کسی ایک خاص حصّہ کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اسبات کے مدعی ہیں کہ جب سے ہم نے خدا کو پایا ہے اسکے بعد ہماری ساری عمر اسی مشاہدہ میں گذری ہے گویا ان کا یہ مشاہدہ ایک غیر منقطع عرصہ کی صورت میں سالہا سال پر پھیلا ہوا ہے اور مرتے دم تک ان سے جدا نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں کوئی عقلمند آدمی انکے متعلق یہ خیال نہیں کر سکتا ہے کہ انہیں دھوکا لگا ہوگا کیونکہ اگر ان حالات میں بھی دھوکے کا احتمال تسلیم کیا جاوے تو پھر ہمارا کوئی مشاہدہ بھی اس احتمال سے باہر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور دنیا کے سارے علوم مخفی سفسطہ اور وہم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بیشک ایسی صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہادت دینے والوںکے دماغ میں نقص ہے لیکن انکو صحیح الدماغ تسلیم کر کے دھوکا خوردہ قرار نہیں دیا جا سکتا +

تیسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ شہادت کسی ایک فرد کی نہیں ہے کسی ایک قوم کے لوگوں کی نہیں ہے کسی ایک ملک کے باشندوں کی نہیں ہے کسی ایک زمانہ کے لوگوں کی نہیں ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کی ہے جو دنیا کے ہر ملک ہر قوم ہر ملت ہر زمانہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پس تم کس کس کو دھوکا خوردہ قرار دوگے؟ ایک کو دھوکا لگ سکتا ہے دو کو لگ سکتا ہے کسی ایک زمانہ میں دھوکا لگ سکتا ہے کسی ایک قوم میں دھوکا لگ سکتا ہے لیکن یہ عجیب دھوکا ہے کہ لاکھوں صحیح الدماغ شخص جو مختلف قوموں اور مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں عموماً ایک دوسرے سے بے خبری کی حالت میں گذرے ہیں سارے کے سارے اس دھوکے کا شکار ہو گئے۔ پس اس شہادت میں اتنی بڑی جماعت کا پیش ہونا۔ اور ہر قوم ہر ملت ہر زمانہ اور ہر ملک کیطرف سے پیش ہونا اور سب کا ایک دوسرے سے آزاد ہو کر مستقل طور الگ الگ اس شہادت کا دینا ایک ایسی دلیل ہے جس میں کوئی عقلمند دھوکا لگنے کا احتمال تسلیم نہیں کر سکتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ انبیاء اور اولیاء اور صلحاء یہ کہتے ہیں۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کو دیکھا اور پہچانا ہے اور دنیا تسلیم کرتی ہے کہ وہ دروغگو نہیں۔ دوکاندار نہیں مجنون نہیں مخبوط الحواس

نہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ وہ ایک دو نہیں - دس بیس نہیں - سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں ہیں اور ہر ملک ہر قوم ہر ملت ہر زمانہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر اک ایک دوسرے سے آزاد ہو کر مستقل طور پر اپنی شہادت پیش کرتا ہے اور یہ شہادت بھی کسی سُنی سنائی بات پر مبنی نہیں بلکہ ذاتی اور گویا عینی مشاہدہ پر مبنی ہے اور یہ مشاہدہ بھی ایسا ہے کہ جو ان لوگوں کی ساری عمر پر پھیلا ہوا ہے۔ پس ہم مجبور ہیں کہ جس طرح ہم دُنیا کے دوسرے امور میں شہادت پر اپنے علم اور فیصلہ کی بنا رکھتے ہیں اسی طرح انکی شہادت کو بھی قبول کر کے اسبات کے قائل ہوں کہ یہ دُنیا ایک واحد خالق و مالک علیم و حکیم قدیر و متصرف ہستی کے ماتحت ہے جسکے قبضہ قدرت سے دُنیا کی کوئی چیز باہر نہیں - قرآن شریف نے بھی اس شہادت کے اصول کو تسلیم کیا ہے بلکہ اسی اصل کے ماتحت انبیاء کا ایک نام قرآن شریف میں شاہد رکھا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (سورہ مزمل) یعنی ”اے لوگو ہم نے تمہاری طرف محمد صلعم کو رسول بنا کر بھیجا ہے تا کہ وہ تمہارے لئے بطور شاہد کے ہو جیسا کہ فرعون کی طرف موسیٰ رسول کو شاہد بنا کر بھیجا تھا“ الغرض شہادت رُسل و صالحین کی دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ کوئی سمجھدار شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا ؛

اب میں بفضلہ تعالیٰ ان عقلی دلائل کی بحث ختم کر چکا ہوں جو میں اس مضمون میں ہستی باریتعالیٰ کے متعلق بیان کرنا چاہتا تھا اور ان دلائل کے متعلق جو جو شبہات عقلی طور پر وارد ہو سکتے ہیں ان کا جواب بھی مختصر طور پر ساتھ ساتھ درج کر دیا گیا ہے مگر جیسا کہ مینے ابتدائے مضمون میں بیان کیا تھا - مینے اس مضمون میں پیچیدہ اور باریک بحثوں سے حتی الوسع اجتناب کیا ہے اور صرف موٹی موٹی باتیں عام فہم طریق پر بیان کر دی ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ ایک سلیم الفطرت اور فہمیدہ انسان جو خواہ نخواہ شبہات پیدا کرنیکا عادی نہیں ہے میرے اس مختصر بیان سے اس حد تک ضرور تسلی پا سکے گا جس حد تک کہ عقلی دلائل کے امکان میں ہے - باقی جیسا کہ میں اس مضمون میں دوسری جگہ ذکر کر چکا ہوں حقیقی اطمینان اور عین الیقین تو صرف تجربہ اور مشاہدہ سے ہی حاصل ہو سکتا ہے - اور مشاہدہ کا طریق انشاء اللہ آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان کیا

جاوے گا۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ

خدا پر ایمان لانا اپنے اندر عظیم الشان فوائد رکھتا ہے

اس کے بعد میں ہستی باریتعالیٰ کے متعلق چند ایسے دلائل بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس اصول پر مبنی ہیں کہ خدا پر ایمان لانا اپنے اندر بعض ایسے اہم فوائد رکھتا ہے جو بغیر اس پر ایمان لانے کے کسی اور طریق سے پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ دُنیا میں جب کوئی چیز اختیار کیجاتی ہے تو اس اصول پر کیجاتی ہے کہ وہ کس حد تک مفید اور نفع بخش ہے اور بنی نوع انسان پر اس چیز کا اختیار کرنا کیا فائدہ مند اثر پیدا کرتا ہے۔ پس اگر یہ بات ثابت ہو جاوے کہ خدا پر ایمان لانا نسل انسانی کے لئے بہت مبارک اور نفع بخش ہے تو ہر عقلمند اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اس صورت میں اور نہیں تو صرف اس فائدہ کی خاطر ہی خدا کے عقیدہ کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ بیشک ان دلائل سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ اس دُنیا کے اوپر کوئی خدا ہے یا ہونا چاہیئے لیکن ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ خدا کا عقیدہ نسل انسانی کی ترقی اور بہبودی کے لئے نہایت مفید ہے اور چونکہ مفید چیز اختیار کی جانی چاہیئے۔ اس لئے یہ دلائل بھی ہستی باریتعالیٰ کی تائید میں بالواسطہ پیش کئے جاسکتے ہیں گویا جس طرح میں نے عقلی دلائل کے شروع میں ایک احتیاطی دلیل بیان کی تھی جو اس اصل پر مبنی تھی کہ چونکہ خدا پر ایمان لانے میں کوئی نقصان نہیں اور انکار کرنا نقصان کے احتمالات رکھتا ہے اس لئے ایمان لانا اقرب بالامن ہے۔ اسی طرح عقلی دلائل کی بحث کے اختتام پر میں یہ دوسری قسم کے احتیاطی دلائل بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس اصول پر مبنی ہیں کہ چونکہ خدا کا عقیدہ نسل انسانی کے لئے مفید اور نفع بخش ہے اس لئے ایمان لانا بہرحال بہتر اور قابل ترجیح ہے لیکن اس جگہ یہ بات یاد رکھنی

چاہیئے کہ یہاں ان عظیم الشان فوائد سے بحث نہیں جو مذہبی یا روحانی طور پر ایمان باللہ اور تعلق باللہ سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ یہاں صرف ان اصولی فوائد کا ذکر ہے جو خدا کے اوپر معقولی طور پر ایمان لانیکے نتیجہ میں بنی نوع انسان کو عام طور پر حاصل ہوتے یا ہوسکتے ہیں اور اس لئے اس جگہ صرف ان موخرالذکر فوائد کا ہی ذکر کیا جاوے گا۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ؛

ایمان باللہ وحدت و اخوت کا جذبہ پیدا کرتا ہے

سب سے پہلے جو فائدہ ایمان باللہ کا میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خدا کا خیال لوگوں کے دلوں میں وحدت و اخوت کے جذبات پیدا کرنیکا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور یہ جذبات نسل انسانی کی ترقی اور بہبودی کے لئے نہایت درجہ ضروری اور مفید ہیں۔ دُنیا کے امن اور اقوام عالم کی خاطر خواہ ترقی و بہبودی کے لئے یہ بات از بس ضروری بلکہ لابدی ہے کہ مختلف اقوام باہم محبت اور اخوت اور تعاون کے ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کے خلاف بیجا تعصب کو اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دیں بلکہ حتّی الوسع دوسروں کے متعلق ہمدردی اور قربانی اور ایثار کا طریق اختیار کریں۔ اور اسی طرح افراد کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے متعلق محبت اور اخوت اور ہمدردی اور تعاون کی رُوح پیدا کریں۔ کیونکہ بغیر اس رُوح کے جو افراد اور اقوام ہر دو کے واسطے ایکسی ضروری ہے دنیا میں امن کا قیام اور نسل انسانی کی خاطر خواہ ترقی و بہبودی محال ہے۔ پس ہر اک بہی خواہ بنی آدم کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام ایسے ذرائع کے اختیار کرنے کے درپے رہے جن سے کہ باہم وحدت و اخوت کی رُوح پیدا ہوتی اور ترقی کرتی رہے اور بغض اور حسد اور بیجا رقابت اور تعصب کے خیالات دلوں میں جاگزین نہ ہونے پائیں۔ اور جیسا کہ مینے اوپر بیان کیا ہے ان ذرائع میں سے خدا کا عقیدہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قطعی الاثر ذریعہ ہے واقعی یہ عقیدہ کہ ہم سب لوگ باوجود اپنے کثیر التعداد اور گونا گون اختلاف کے ایک واحد قادر و متصرف مدرک بالارادہ خدا کی مخلوق و مملوک ہیں اور ہم سب کا ملجا و ماوا وہی یکتا ہستی ہے جسکے قبضۂ تصرف سے دنیا کی کوئی چیز باہر نہیں جس مضبوطی اور جس پختگی اور جس وضاحت کے ساتھ ہمارے دلوں میں باہم محبت و وحدت و اخوت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ بیشک ایک ملک کا باشندہ

ہونا یا ایک قوم سے تعلق رکھنا یا ایک نظام حکومت کے ماتحت ہونا وغیرہ الک۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ جو کم و بیش وحدت و اخوت کا موجب ہوتی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر یہ ایمان ہے کہ ہم ایک واحد خالق کی پیدا کردہ ہستیاں اور ایک واحد منبع فیوض سے جاری شدہ نہریں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارا یہ مالک و آقا ایک فوت شدہ باپ کی طرح نہیں جسکے بعد نالائق بیٹے بعض اوقات آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ وہ اب بھی ہمارے سروں پر زندہ سلامت موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ ایمان تمام بنی نوع آدم کو فوراً بھائی بھائی بنا کر ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے اور اس یقین کے پیدا ہوتے ہی دلکی تمام کدورتیں اور کینے اور باہم بغض و عداوت کے خیالات کافور ہونے اور انکی جگہ محبت و اخوت اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور قربانی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ خدا پر ایمان لانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھنا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ خدا کو ماننے پھر بندہ کا تعلق خدا کے ساتھ ایسا گہرا اور ایسا وسیع تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جسکی مثال دنیاوی رشتوں میں پائی جانی ممکن نہیں الغرض خدا پر ایمان لانا باہم محبت و اخوت کے جذبات پیدا کرنے کیلئے ایک ایسا زبردست ذریعہ ہے کہ جسکے مقابلہ میں باقی تمام ذرائع ہیچ ہیں۔ بیشک جیسا کہ میں اوپر بیان کیا ہے ملک اور قوم وغیرہ کے خیالات یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں لیکن اول تو ان کا اثر ایسا قوی اور گہرا نہیں ہوتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ صرف ایک محدود حلقہ میں یہ اثر پیدا کر سکتے ہیں اور تمام نسل انسانی کے اندر مشترکہ طور پر ایسے جذبات پیدا کرنا انکے لئے ناممکن ہے بلکہ بسا اوقات ان کا اثر فرقہ بندی اور بیجا تعصب اور حسد کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے جو بجائے مفید ہونیکے اُلٹا نقصان دہ ہوتا ہے اور صرف خدا کا عقیدہ ہی ایسا ذریعہ ہے جو نسل انسانی کے اندر عالمگیر صورت میں وحدت و اخوت کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور اگر ہم خدا کا خیال لوگوں کے دلوں سے الگ کر لیں تو یہ وحدت و اخوت کے خیالات فوراً غائب ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے درمیان صرف ضابطہ اور معاملہ کے خشک تعلقات باقی رہ جاتے ہیں جو کبھی بھی قلوب کے اندر کوئی جذباتی رشتہ پیدا نہیں کر سکتے۔ خوب غور کر لو کہ اگر خدا کوئی نہیں اور ہر انسان خود اپنے آپ سے ہے اور ایک مستقل اور آزاد ہستی رکھتا ہے تو پھر نہ

کوئی اخوت رہ سکتی ہے اور نہ کوئی وحدت بلکہ خود غرضی اور بیجا رقابت اور حسد کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے جو دنیا میں امن شکنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ وہ بات جو یقینی اور قطعی طور پر تمام نسل انسانی کے اندر اخوت کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے وہ صرف خدا کا خیال ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اور یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اس عقیدہ کو الگ کر کے پھر دنیا میں یہ جذبہ عالمگیر صورت میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر قائم رہ سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شخص جو خدا پر ایمان لانیکا مدعی ہے باہم اخوت و وحدت کے جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے کیونکہ دُنیا میں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں چیزیں انسان کی حالت پر اثر ڈالتی رہتی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ بعض دوسرے بواعث کی وجہ سے ایک خدا پر ایمان لانیوالے شخص کا دل بھی ان پاکیزہ جذبات سے خالی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی آدمی کے دل میں خدا کا خیال ایک ایسا کمزور خیال ہو کہ جو اسکے دل و دماغ پر اتنا اثر پیدا نہ کرسکے کہ جو اخوت و وحدت کے جذبات پیدا کرنیکے لئے ضروری ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اصولی طور پر خدا کا عقیدہ ان جذبات کے پیدا کرنیوالے موجبات میں سب سے اہم اور بڑا ہے اور اگر کوئی دوسرے موانع نہ پیش آجائیں تو یقیناً ایک مومن باللہ ایک کافر باللہ کی نسبت نسل انسانی کا زیادہ ہمدرد زیادہ خیر خواہ زیادہ محبت کرنیوالا ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جو دل سے خدا پر ایمان لاتا ہے اس بات کی شہادت دیگا کہ خدا کا خیال اس کے دل میں بڑے زور کے ساتھ اخوت کے جذبات پیدا کرتا رہتا ہے اور نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ ان جذبات کا اثر اس کے اعمال میں بھی رونما ہوتا ہے اور اگر وہ اپنے نفس کے مطالعہ کا عادی ہو تو اس کا دل پورے یقین کے ساتھ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اگر نعوذ باللہ خدا کا خیال الگ کرلیا جاوے تو پھر کبھی بھی اسکی یہ حالت نہیں رہ سکتی۔ اور انسان تو انسان ہے ادنیٰ قسم کے حیوانات بلکہ نباتات اور جمادات کے ساتھ بھی یہ عقیدہ ایک قسم کی محبت اور موانست اور اپنا ہٹ کے جذبات پیدا کرنیکا موجب ہوتا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے لو می لو مائی ڈاگ یعنی اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو پھر میرے کتے سے بھی محبت کرنی ہوگی یعنی جن چیزوں کا میرے ساتھ تعلق ہے انکو بھی اپنی محبت میں شریک کرنا ہوگا۔ یہ مثل ایک نہایت سچی اور فطرت انسانی کے صحیح مطالعہ پر مبنی ہے اگر ہمیں خدا پر ایمان اور خدا کے ساتھ تعلق ہے تو پھر یہ قطعاً ناممکن ہے

کہ ہمارا دل مخلوقات اور خصوصاً انسان کی محبت سے خالی رہ سکے۔ میں اسبات کو قبول کر سکتا ہوں کہ ایک شخص جو خدا پر ایمان لانیکا مدعی ہے وہ اپنے دعوئی میں جھوٹا یا دھوکا خوردہ ہے لیکن یہ بات میں ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا (کیونکہ یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے) کہ جو شخص واقعی خدا پر ایمان لاتا ہے اس کا دل مخلوقات کی محبت و ہمدردی کے خیالات سے خالی رہ سکتا ہے اور تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سب سے زیادہ پختگی اور یقین کے ساتھ ایمان باللہ پر قائم ہوئے ہیں وہی وہ لوگ ہیں جو ہمدردی خلق اور محبت بنی نوع انسان کے جذبات میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پر تسلیم کئے جاتے ہیں اور جوں جوں لوگ اس ایمان میں کمزور ہوتے جاتے ہیں یہ محبت واخوت کے جذبات بھی انکے اندر کمزور ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ الغرض اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ خدا کا عقیدہ نسل انسانی میں وحدت واخوت کے جذبات پیدا کرنے کا سب سے مضبوط اور یقینی اور سریع الاثر ذریعہ ہے اور چونکہ وحدت و اخوت کے خیالات دنیا میں قیام امن اور اقوام عالم کی خاطر خواہ ترقی و بہبودی کے لئے نہایت ضروری ہیں اس لئے اس جہت سے بھی ہر عقلمند انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مفید اور بابرکت عقیدہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ وھو المراد ؛

اس جگہ کسی شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا کے منکرین بھی بسا اوقات دوسروں کے ساتھ محبت و ہمدردی کا سلوک کرتے اور رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جذبات کے پیدا کرنیکے لئے خدا پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ دعوئی ہرگز نہیں کیا کہ یہ جذبات سوائے ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ ہم تو خود اسبات کے قائل ہیں کہ بہت سی چیزیں کم و بیش اس کا موجب ہوتی ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ تمام بنی نوع آدم میں مجموعی طور پر اکمل و اتم صورت میں یہ جذبات صرف ایمان باللہ کے نتیجہ میں ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور باقی ذرائع اپنی کیفیت اور کمیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پس ہمارا دعوئی صرف اس صورت میں غلط ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہ بات ثابت کی جاوے کہ یا تو از روئے عقل خدا کا عقیدہ اخوت و وحدت کے خیالات کا موجب ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یا یہ کہ تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے یہ دکھایا جاوے کہ خدا پر ایمان لانیوالوں کی نسبت خدا کا انکار کرنے

والے نسل انسانی کے زیادہ ہمدرد زیادہ خیر خواہ اور زیادہ محبت کرنیوالے ہوتے ہیں اور جب تک ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ثابت نہ ہو جاوے اسوقت تک کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اس بنا پر کہ ایک دہریہ بھی ایک حد تک یہ جذبات رکھتا ہے یہ غیر طبعی استدلال کرے کہ خدا کا عقیدہ ان جذبات کے پیدا ہونیکا موجب نہیں۔ یا یہ کہ دہریت ان خیالات کے پیدا ہونیکی موجب ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی ہوش و حواس رکھنے والا انسان ایک لمحہ کے لئے بھی اسبات کو قبول کر سکتا ہے کہ خود اپنی ذات میں دہریت ان خیالات کا موجب ہو سکتی ہے۔ یا یہ کہ خدا کا عقیدہ ایسے جذبات پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں باتیں اسقدر بین طور پر غیر طبعی اور خلاف فطرت ہیں کہ کوئی عقلمند آدمی انہیں قبول نہیں کر سکتا۔ خدا کا وجود (اگر اسے تسلیم کیا جاوے) وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں تمام مخلوقات بالآخر جا کر جمع ہو جاتی ہے اور وحدت اور جمعیت کا خیال اس نقطہ کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر لگا ہوا ہے اور اسے نظر انداز کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ اس کائنات کو بغیر کسی مرکز یا منبع کے تسلیم کیا جاوے اور اس خیال کے آتے ہی وحدت و یگانگت کے خیالات کافور ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک باپ کی اولاد ہونا وحدت و اخوت کا موجب نہیں ہو سکتا بلکہ مختلف باپوں کی اولاد ہونا اس کا موجب ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس اگر کبھی مختلف باپوں کے بیٹے آپس میں صلح اور محبت کا طریق رکھتے ہیں تو ہم اس سے یہ غیر طبعی نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک باپ کی اولاد ہونا محبت و اخوت کا موجب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس صورت میں ہم یہ سمجھیں گے کہ اس جگہ کوئی اور موجبات اثر ڈال رہے ہیں جنہوں نے باوجود مختلف باپوں کے بیٹے ہونیکے ان کو ایک نقطہ پر جمع کر رکھا ہے نہ یہ کہ مختلف باپوں کی اولاد ہونے نے یہ اثر پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ہر عقلمند تسلیم کریگا کہ اگر یہی مختلف باپوں کے بیٹے جنہیں بعض وجوہات نے باوجود اس اختلاف کے وحدت و یگانگت کی لڑی میں پرو رکھا ہے۔ ایک ماں باپ کی اولاد ہوتے تو پھر ان کی باہمی محبت و اخوت اکمل اور اتم صورت میں ظاہر ہوتی۔ پس اگر خدا کے منکرین بھی بعض حالات میں نسل انسانی کے ساتھ محبت و ہمدردی کا طریق اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب ہمیں خدا کے عقیدہ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ جذبات اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے

اکمل اور اتم صورت میں تبھی ظاہر ہو سکتے ہیں کہ جب علاوہ اور موجبات وحدت کے لوگ خدا کے عقیدہ پر بھی قائم ہوں اور اپنے آپ کو ایک واحد منبع خلق سے پیدا شدہ ہستیاں اور ایک واحد چشمہ حیات سے جاری شدہ نہریں تسلیم کریں۔ میرے عزیزو۔ میں تمہیں یہ کس طرح یقین دلاؤں کہ خدا پر ایمان لانا (بشرطیکہ وہ حقیقی اور زندہ ایمان ہو) انسان کے دل میں بنی نوع آدم کی محبت اور خیر خواہی اور انکے ساتھ جذبہ اخوت کا ایک ایسا وسیع سمندر موجزن کر دیتا ہے کہ جسکی کسی دوسری جگہ نظیر ملتی ناممکن ہے اور ان جذبات کے پیدا ہونیکے لئے باقی جتنے بھی موجبات ہیں وہ اسکے مقابل میں اپنی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ اور یہ سوال کہ ایک دہریہ ایسے جذبات کیوں رکھتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً اسکی دو وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ دہریہ اپنے اردگرد کے مذاہب کی تعلیم سے محسوس یا غیر محسوس طور پر متاثر ہو کر اس نتیجہ پر قائم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کی ہمدردی اور محبت ایک مستحسن فعل ہے جسے اگر وہ اختیار نہ کرے تو وہ لوگوں کی نظر سے گر جائے گا۔ اور اس صورت میں علاوہ اسکی ذاتی بدنامی کے لوگوں کو اسکے عقائد پر بھی یہ حرف گیری کا موقعہ ملیگا کہ چونکہ یہ شخص دہریہ ہے اس لئے اسکے دل میں بنی نوع آدم کے متعلق محبت و اخوت کے جذبات نہیں ہیں۔ پس دانستہ یا نادانستہ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ کسی ایسے فعل میں جو مسلمہ طور پر مستحسن سمجھا جاتا ہے وہ ان لوگوں سے پیچھے نہ رہے جو خدا کے قائل ہیں گویا مقابلہ کا خیال اور بدنامی کا ڈر اس سے یہ کام کرواتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کے اندر کبھی بھی یہ جذبات اعلیٰ اور اکمل صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اور وہ بے لوث اور بے غرضانہ اور طبعی رنگ پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک خدا پر ایمان لانیوالے شخص میں پایا جاتا ہے۔ اسکی محبت ایسی ہی محبت ہوتی ہے جیسا کہ ایک سوتیلی ماں اپنے خاوند کو خوش کرنیکے لئے یا محلہ والوں میں بدنامی سے بچنے کیلئے اپنے خاوند کی فوت شدہ بیوی کے بچوں سے کرتی ہے مگر دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ کجا ماں کی طبعی محبت جو ایک قدرتی چشمہ کے طور پر اسکے سینہ میں اُبلتی رہتی ہے اور کجا سوتیلی ماں کا ظاہر داری کا سلوک۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح دہریہ بھی اس بات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے کہ نسل انسانی کی ترقی و بہبودی اور سوسائٹی کے قیام کیلئے یہ ضروری ہے کہ لوگ آپس میں محبت و سلوک سے رہیں

اور باہم تعاون کا طریق اختیار کرکے ایسے کاموں میں حصہ لیں جو لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی اور علمی اور اقتصادی بہبودی کا موجب ہیں۔ پس دنیا کے ایک شہری ہونیکی حیثیت میں بھی ایک دہریہ اس قسم کے خیالات اور جذبات پیدا کرنیکی کوشش کرتا ہے اور اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی ایک ضابطہ اور معاملہ کا رنگ رکھتی ہے اور وہ طبعی اور جذباتی رشتہ پیدا نہیں کر سکتی جو ایمان باللہ کا عقیدہ پیدا کرتا ہے اور ایسا شخص جو محض اس بنا پر ہمدردی خلق اللہ کے خیالات پیدا کرتا ہے کبھی بھی اس شخص کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا جو اس لئے نسل انسانی کے ساتھ محبت و اخوت کے تعلقات رکھتا ہے کہ بوجہ ایک خدا کی مخلوق ہونیکے یہ جذبہ اسکی فطرت کا حصہ ہے۔ گویا جہاں خدا کا خیال فطری اور طبعی طور پر یہ جذبات انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے وہاں یہ دوسری قسم کے خیالات جو سوچ بچار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں محض ضابطہ اور معاملہ کے رنگ میں انسان کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں پس فرق ظاہر ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دہریہ کے دل میں نسل انسان کی ہمدردی کے خیالات جن وجوہات سے پیدا ہوتے ہیں وہ اسے قطعاً اس اعلیٰ اور اشرف مقام تک نہیں پہنچا سکتے جو ایمان باللہ کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ جو باقی وجوہات ہمدردی اور محبت کے خیالات کے پیدا ہونیکی موجب ہیں یہ عام ہیں جن سے ایک مومن باللہ بھی اسی طرح فایدہ اُٹھا سکتا ہے جیسا کہ ایک دہریہ اُٹھاتا ہے لیکن ایمان باللہ کے نتیجہ میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ خاص مومنین کیلئے ہیں جنسے ایک دہریہ کسی صورت میں بھی متمتع نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ جہاں بہت سے اسباب کسی نتیجہ کے پیدا کرنے میں مجموعی طور پر اثر ڈالینگے وہاں نتیجہ زیادہ اکمل اور اتم صورت میں ظاہر ہوگا۔ پس اس لحاظ سے بھی خدا کا عقیدہ بہر حال مفید اور نفع بخش ٹھہرتا ہے + وھو المراد

اسکے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اور جتنے بھی موجباتِ وحدت ہیں وہ گو ایک حد تک تعاون اور ہمدردی اور قربانی کی رُوح پیدا کر دیں لیکن اخوت انسانی کا جذبہ وہ کسی صورت میں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اخوت کا جذبہ یعنی یہ خیال کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں سوائے اسکے اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا کہ انسان کے اوپر ایک واحد

خالق و مالک و آقا کے وجود کو تسلیم کیا جاوے۔ کیونکہ اخوت کے معنے ہی یہ ہیں کہ ہم سب ایک منبع سے نکلی ہوئی ہستیاں ہیں۔ لہذا اور اسباب خواہ کتنی بڑی حد تک بھی افراد و اقوام کے درمیان تعاون و ہمدردی کا رشتہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاویں۔ لیکن انکے نتیجہ میں اخوت کا جذبہ کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ پس اس لحاظ سے بھی ایمان باللہ کی ضرورت اور اس کا مفید ہونا ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک نسل انسانی میں اخوت اور وحدت کا جذبہ فطری طور پر پیدا نہ ہو جاوے اسوقت تک ان کا ظاہری اتحاد اور تعاون اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر کوئی اعتماد کیا جا سکے بلکہ اس صورت میں ہر وقت اسبات کا اندیشہ رہے گا کہ جب کبھی بھی ذرا کسی کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوگی تو فوراً خود غرضی کے خیالات غالب آکر بغض و عداوت کا رنگ پیدا کر دینگے۔ دنیا کا امن یقیناً اسوقت تک سخت خطرہ میں ہے جب تک کہ لوگ ایک زندہ حقیقت کے طور پر اپنے اندر یہ ایمان قائم نہ کر لیں کہ ہمارے اوپر ایک واحد خدا ہے جو ہمارا خالق و مالک ہے اور اس لئے ہم سب کو بھائی بھائی بنکر رہنا چاہیئے اور اگر کبھی ہمارے اندر اختلاف بھی پیدا ہو تو ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے بلکہ ایک دوسرے کی خاطر قربانی اور ایثار کا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ دراصل غور سے دیکھا جاوے تو ضابطہ اور معاملہ کے تعلقات محض خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ انسان محسوس کرتا ہے کہ اگر میں دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات نہ رکھونگا۔ تو دوسرے بھی میرے ساتھ اچھی طرح پیش نہ آئینگے اور اس طرح میرے مفاد کو نقصان پہنچے گا اور اس لئے خود حفاظتی کے طور پر وہ حُسنِ سلوک کا طریق اختیار کرتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا برتاؤ کرتا ہے۔ تا کہ اسکے نتیجہ میں لوگ اس کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا طریق اختیار کریں اور ہر چند کہ اس صورت کا نتیجہ بھی عملاً مفید اور نفع بخش ہی ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس خود غرضانہ صورت کو اس اعلیٰ اور اشرف مقام سے کچھ بھی نسبت نہیں کہ جس میں ایک طبعی اور فطری جذبہ کے طور پر لوگوں کے درمیان اخوت و وحدت کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور یہ فطری جذبہ جو اخوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بغیر ایمان باللہ کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا +

پیشتر اس کے کہ میں ایمان باللہ کا دوسرا فایدہ بیان کروں۔ ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے

جو بعض لوگوں کیطرف سے پیدا کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دُنیا میں مذاہب کا وجود باہم جنگ و
جدال اور فتنہ و فساد اور فرقہ بندیوں کا موجب رہا ہے اور علاوہ ازیں مذہب انسان کے اندر
تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا کرتا ہے جو دُنیا میں قیام امن اور نسل انسانی کی ترقی و بہبودی کے لئے
سم قاتل ہے اس لئے لوگوں کو مذہب کی قیود سے آزاد ہونیکی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ وسعت
خیالی پیدا ہو اور لوگ آپس میں محبت اور امن کے ساتھ رہ سکیں۔ اور چونکہ مذہب خدا کے
خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اس لئے ہمیں ساتھ ہی ایسے خدا کو بھی خیرباد کہنا چاہیئے جس کا
خیال دُنیا میں فتنہ و فساد کا باعث ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو آجکل کے نوتعلیم یافتہ طبقہ
کیطرف سے کیا جاتا ہے اور جس پر یورپ کے مدبرین بھی بہت زور دیتے ہیں لیکن اگر ہم ذرا غور
سے کام لیں تو یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ یہ اعتراض محض قلت تدبر کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے مگر
اصل جواب دینے سے قبل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر ہم اس اعتراض کو درست بھی مان لیں
یعنی اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ واقعی مذہب کا وہی نتیجہ ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔ پھر بھی
اس سے خدا کے موجود ہونے کے خلاف کوئی استدلال نہیں ہوتا یعنی اس سے یہ ثابت نہیں
ہو سکتا کہ اس دُنیا کا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکے گا کہ
خدا کا عقیدہ تنگ خیالی اور امن شکنی کا موجب ہے لیکن اگر واقعی کوئی خدا موجود ہے تو پھر
اس کا ماننا خواہ کچھ بھی نتیجہ پیدا کرے ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اسکے موجود ہونیسے
ہی انکار کر دیں۔ پس اگر خدا کا موجود ہونا ثابت ہے تو پھر خواہ مذہب فتنہ و فساد کا ہی موجب
ہو ہم خدا کے موجود ہونے سے انکار نہیں کر سکتے لیکن حق یہ ہے کہ یہ بات ہی غلط اور باطل
ہے کہ مذہب فتنہ و فساد کا موجب ہوتا ہے اور جن لوگوں نے ایسا نتیجہ نکالا ہے انہوں
نے خطرناک غلطی کھائی ہے۔ ہم ابھی ابھی یہ ثابت کر چکے ہیں کہ خدا کا خیال طبعاً اور فطرتاً
لوگوں کے دلوں میں باہم محبت و اخوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور تمام قومی اور ملکی اور نسلی
تعصبات کو مٹا کر ایک عالمگیر اخوت انسانی کا خیال قائم کرنے کا موجب ہے بلکہ ایمان
باللہ کے بغیر اس عالمگیر اخوت کا خیال پیدا ہونا ہی ناممکن ہے۔ پس یہ کس طرح ہو سکتا
ہے کہ خدا کا عقیدہ فتنہ و فساد اور تنگ خیالی کا موجب ہو۔ فتنہ و فساد اور تنگ خیالی

کے پیدا ہونے کو ہرگز کوئی طبعی تعلق خدا کے خیال سے نہیں ہے اور عقل انسانی ایک لمحہ کیلئے بھی اسبات کو قبول نہیں کرسکتی کہ خدا کے خیال کا نتیجہ ہاں ایسے خدا کے خیال کا نتیجہ جسے انسان کوئی قومی یا ملکی یا نسلی خدا نہ سمجھتا ہو بلکہ تمام بنی نوع آدم کا مشترکہ خالق و مالک خدا قرار دیتا ہو۔ تنگ خیالی اور تعصبات قومی اور جنگ وجدال اور فرقہ بندی کی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے۔ کوئی صحیح الدماغ شخص ان دو باتوں میں سبب اور مسبب کا کوئی طبعی رشتہ دریافت نہیں کرسکتا۔ پس اگر واقعی مذاہب کا وجود فتنہ و فساد اور تنگ خیالی اور تعصبات ملی کا موجب ہے تو ہمیں کسی دوسری جگہ اس کا سبب تلاش کرنا چاہیئے۔ اور غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے نہ یہ کہ سراسر ظلم اور تعدی کے ساتھ اور بالکل غیر طبعی طور پر ہم اسے خدا کے عقیدہ کیطرف منسوب کردیں۔ بات یہ ہے کہ بدقسمتی سے اعتراض کرنیوالوں کے سامنے مذاہب کی ایسی حالت پیش ہوئی ہے کہ جس میں سوائے مذہب کے نام کے اور کچھ نہیں۔ یہ اعتراض موجودہ زمانہ کا مخصوص اعتراض ہے اور بدقسمتی سے اس زمانہ میں تمام مذاہب کے متبعین اپنے مذاہب کی حقیقت سے دور پڑے ہوئے ہیں اور کوئی ایک مذہب بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ جسکے پیرو اپنے مذہب کی حقیقت پر قایم ہوں بلکہ خود مذاہب کی شکل وصورت انسانی دست وبُرد سے بُری طرح مسخ ہوچکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد طبع لوگوںکو مذہب پر اعتراض کرنیکا موقعہ مل گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں قیام امن کیلئے اور نسل انسانی کی دماغی تنویر کے واسطے مذہب سب ذرائع میں سے بڑا ذریعہ ہے اور جب کبھی بھی لوگ مذہب کی حقیقت پر قائم ہوئے ہیں فتنہ و فساد اور بیجا جنگ و جدال کے خیالات ان میں سے مٹنے شروع ہوگئے ہیں اور وسعت خیالی اور عالی حوصلگی پیدا ہونی شروع ہوگئی ہے کسی مذہب کی تاریخ کو دیکھو اور اسکے اس زمانہ کو لے لو جس میں اسکے متبعین اس مذہب کی حقیقت پر قائم نظر آتے ہیں اور پھر تم دیکھو گے کہ وہ لوگ کیسے عالی حوصلہ اور وسیع خیال اور ہمدرد بنی نوع انسان اور امن اور صلح کے خواہاں نظر آتے ہیں اور پھر اسکے مقابل میں اس مذہب کی تاریخ کے اس زمانہ کو لو جس میں اسکے متبعین اپنے مذہب کی حقیقت سے دُور ہوگئے ہوں اور محض اسمی اور رسمی طور پر مذہب کیطرف منسوب ہوتے ہوں اور تم دیکھو گے کہ تمہیں اسکے متبعین میں تنگ خیالی کم حوصلگی

بیجا تعصبات ملی چھوٹے چھوٹے اختلافات پر لڑتے جھگڑنے کا خیال اور امن شکنی کی طرف میلان نظر آئیگا۔ میں یہ دعویٰ بلا خوفِ تردید کرتا ہوں اور ہر مذہب و ملت کے متعلق کرتا ہوں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو کوئی بھی دیانتداری کے ساتھ اس مسئلہ میں تاریخی تحقیق کریگا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا جو میں نے اس جگہ بیان کیا ہے۔ میں بفضلہ تعالیٰ ایک مسلمان ہوں۔ اور آنحضرت صلعم (فداہ نفسی) کے ادنیٰ ترین خادموں میں اپنے آپ کو شمار کرنا اپنے لئے سب فخروں سے بڑھ کر فخر سمجھتا ہوں مگر میں اس افسوسناک اعتراف کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آجکل دوسری قوموں کیطرح مسلمان کہلانیوالے بھی اس خطرناک اور مہلک مرض میں مبتلا ہیں کہ جو تنگ خیالی کے نام سے موسوم ہے اور بیجا تعصبات ملی نے انکی انسانیت کے اعلیٰ اور اشرف جذبات کو مغلوب کر رکھا ہے اور بات بات میں جھگڑنا اور لڑنا اور بیہودہ اختلافات پیدا کر کے امن شکنی کیطرف مائل ہو جانا انکی عادت میں داخل ہو گیا ہے مگر کیا یہ اسلام کا قصور ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ جب مسلمان اسلام پر قائم تھے اور اسلامی روح انکے اندر زندہ تھی اس وقت انکے اندر یہ باتیں نہ تھیں بلکہ اسوقت وہ ایک روشن خیال وسیع حوصلہ بنی نوع آدم کی خیر خواہ اور ہمدرد امن پسند صلح جو اور دوسروں کی خاطر قربانی اور ایثار دکھانے والی قوم تھے جس نے اپنے عالمگیر نور کی کرنوں سے دنیا بھر میں اجالا کر رکھا تھا مگر اب اس عالیشان عمارت کے کھنڈرات ہیں اور ہم ہیں! اسی طرح دوسری قوموں کا حال ہے۔ عیسائیت جب شروع شروع میں قائم ہوئی تو اس کے متبعین نے قربانی و ایثار اور بنی نوع آدم کی ہمدردی کا بہت اچھا نمونہ دکھایا۔ اور امن پسندی اور صلح جوئی کا طریق رکھا لیکن جب مسیحی لوگ عیسائیت کی اصل تعلیم اور مسیحی روح سے دور جا پڑے تو پھر انہوں نے بھی دنیا میں ظلم و ستم کشت و خون اور بیجا تعصبات مذہبی کا وہ طوفان برپا کر دیا کہ الامان۔ چنانچہ ریفرمیشن کے زمانہ کی تاریخ ہمارے اس دعویٰ کا کافی ثبوت ہے اور غالباً کسی قوم کے حالات میں ایسی تنگ خیالی اور بیجا تعصبات اور امن شکنی اور قتل و غارت کا منظر نہیں آتا کہ جو مسیح علیہ السلام کے نام نہاد متبعین نے ریفرمیشن کے زمانہ میں دکھایا۔ ہندو اور سکھ اور دوسرے مذاہب کی تاریخیں بھی کم و بیش یہی نظارہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور یہ سب مثالیں اس بات کو ثابت کر رہی ہیں کہ در حقیقت جو الزام مذہب پر

لگایا جاتا ہے وہ مذہب پر نہیں پڑتا۔ بلکہ وہ مذہب کی رُوح سے دُور جا پڑنے کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ بدقسمتی سے اس زمانہ میں تمام اقوامِ عالم مذہب کی رُوح کو ضائع کر چکی ہیں اس لئے جلد باز اور کوتہ بین نکتہ چینوں کو یہ اعتراض کرنے کا اچھا موقعہ مل گیا ہے کہ مذہب تنگ خیالی اور امن شکنی پیدا کرتا ہے اور اسی لئے خداوند قدوس نے جو دنیا کو ضلالت کے تاریک گڑھے میں پڑا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔ کمال شفقت اور مہربانی سے اپنے ایک پاک بندہ کو ہدایت خلق اللہ کے لئے مبعوث فرمایا ہے تاکہ تمام وہ اعتراضات جو مذہب کیطرف منسوب ہونے والے لوگونکی بداعمالی کی وجہ سے مذہب پر پڑتے تھے اور اس طرح مخلوق خدا کو خدا کیطرف سے بدگمان کرنیکا موجب ہو رہے تھے ان کا ازالہ ہو اور لوگ اپنے آسمانی آقا و مالک کو پہچان کر پھر بھائی بھائی بنجائیں۔ مگر دشمنانِ خدا نے اس مصلح ربانی کے خادموں اور اس آسمانی ہدایت کے شمع برداروں کے ساتھ بھی وہی جاہلانہ اور متعصبانہ طریق اختیار کر رکھا ہے جو ان لوگوں کی عادت اور شیوہ ہے چنانچہ کابل میں کئی بے گناہ امن پسند احمدی محض احمدی ہونیکی وجہ سے نہایت ظالمانہ طور پر سنگسار کر دیئے گئے اور اس طرح خود مسلمان کہلانے والوں نے غیروں کو اسلام پر یہ اعتراض کرنے کا موقعہ دے دیا کہ اسلام تنگ خیالی اور بیجا تعصب اور ظلم و ستم کی تعلیم دیتا ہے۔ افسوس صد افسوس۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے :۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

خلاصہ کلام یہ کہ مذہب کے متعلق ایسا خیال صرف موجودہ زمانہ کی حالت کے نتیجہ میں پیدا ہُوا ہے ورنہ اگر مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاوے تو یہ بات اظہر من الشمس نظر آتی ہے کہ جب کبھی بھی لوگ مذہب کی رُوح اور حقیقت پر قائم ہوئے ہیں انکے اندر دوسروں کی نسبت زیادہ وسعت خیالی اور روشن دماغی اور امن پسندی اور قربانی اور برداشت کا مادہ پیدا ہو گیا ہے اور تعلیم کے لحاظ سے بھی دیکھیں تو تفاصیل کو الگ رکھ کر کوئی مذہب بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اصولی طور پر امن پسندی اور صلح جوئی اور وسعت حوصلگی کی تلقین نہ کرتا ہو۔ پس تنگ خیالی اور فتنہ و فساد کا مادہ اس تعلیم کو بھلا دینے کا نتیجہ تو ہو سکتا ہے مگر تعلیم پر کاربند ہونے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا جواب جو میں اس شبہ کا دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر غور کیا جاوے تو یہ بات عقلاً بھی محال نظر آتی ہے کہ کوئی ایسا شخص جو مذہب کی حقیقت اور غرض و غایت کو سمجھتا ہو تنگ خیالی اور فتنہ و فساد کا مرتکب ہو سکے۔ مذہب کا مفہوم ملک یا قوم کیطرح نہیں جو جغرافیہ کی حدود یا نسلی قیود میں محصور ہو اور اس کا حلقہ وسیع نہ کیا جا سکے۔ بلکہ مذہب ان عقائد اور خیالات اور ضابطہ عمل کا نام ہے جو کوئی شخص حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق رکھتا ہے اور جسے وہ حق سمجھ کر دوسروں تک بھی وسیع کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ پس مذہب ایک کھلے دروازوں والی عمارت ہے جسکے اندر ہر شخص جو خواہ کسی قوم یا کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو داخل ہو سکتا ہے بلکہ جسکے اندر داخل ہونیکی دعوت ہر مذہبی شخص دوسرونکو دیتا ہے۔ اندریں حالات کوئی شخص جو حقیقی طور پر مذہب کی غرض کو پورا کرنا چاہتا ہے کسی صورت میں بھی تنگ خیالی یا فتنہ و فساد کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ برخلاف اسکے ایسے شخص کی یہ انتہائی کوشش ہوگی کہ وہ اپنے حسن اخلاق اور پُر امن تبلیغ و تلقین سے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنائے اور کسی ایسی بات کا مرتکب نہ ہو جو لوگوں کو اس کا مذہب پسند کرنے کے رستہ میں روک ہو جاوے۔ پس یہ قطعاً محال ہے کہ کوئی شخص جو مذہب کی حقیقت پر قائم ہے اور مذہب کی غائت و غرض کو سمجھتا ہے تنگ خیالی اور فتنہ و فساد کا مرتکب ہو۔

تیسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ اگر بعض اوقات مذہب جنگ و جدال کا موجب ہوتا ہے تو کیا اور چیزیں اس کا موجب نہیں ہوتیں؟ دُنیا میں بیسیوں باتیں ایسی ہیں کہ جو اقوام و افراد کے درمیان جنگ اور فساد کا موجب ہو جاتی ہیں تو کیا اس وجہ سے ان سب کو ترک کر دیا جاویگا؟ ملکی اور سیاسی اختلافات قومی سوالات تجارتی اور اقتصادی امور وغیرہ وغیرہ بیسیوں اس قسم کی باتیں ہیں کہ جو اقوام عالم کے درمیان جنگ و جدال کا باعث ہو جاتی ہیں۔ اور اسی طرح افراد کے درمیان فتنہ و فساد کے پیدا ہو جانے کے سینکڑوں موجبات ہیں جنسے کوئی عقلمند شخص انکار نہیں کر سکتا۔ تو کیا ان سب باتوں کو صرف اس وجہ سے چھوڑ دیا جائیگا کہ کبھی کبھی انکی وجہ سے امن شکنی ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا کیا جاوے تو اسکے یہ معنے ہونگے کہ زندگی کے تمام شعبوں کو ترک کر کے ہر شخص رہبانیت اختیار کر لے تاکہ نہ وہ دوسروں کے ساتھ معاملہ

پڑے اور نہ کوئی اختلاف وانشقاق کی صورت پیدا ہو۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالو۔ دُنیا کے بشتر
جنگ تم کو ایسے نظر آئینگے کہ جن کا باعث مذہبی اختلاف ہرگز نہ تھا بلکہ کسی جگہ کوئی ملکی یا سیاسی
اختلاف تھا۔ اور کسی جگہ کوئی قومی سوال پیدا ہو گیا تھا۔ اور کسی جگہ کوئی اقتصادی اور تجارتی
امر در پیش تھا۔ اور کسی جگہ کوئی اور اسی قسم کی وجہ تھی۔ ابھی جو یہ گذشتہ جنگ یورپ میں بلکہ
ساری دنیا میں وقوع میں آیا ہے اس میں ہرگز کوئی مذہبی سوال نہ تھا۔ بلکہ محض سیاسی بناپر
یہ سارا کُشت وخون وقوع میں آیا۔ اور یہ کُشت وخون بھی ایسا تھا کہ جو اپنی وسعت اور تباہی
کے لحاظ سے دُنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اب سیاست بھی چھوڑ دو کیونکہ وہ بعض
اوقات جنگ کا موجب ہو جاتی ہے۔ میرے عزیزو یہ سب نادانی اور جہالت کی باتیں ہیں
مذہب کو ہرگز کوئی خاص رشتہ تنگ خیالی یا جنگ وجدال سے نہیں ہے بلکہ جس طرح دُنیا
میں اور اور باتیں اقوام وافراد کے درمیان امن شکنی کا موجب ہو جاتی ہیں اسی طرح (گوایسے
بہت کم) کبھی کبھی مذہبی اختلاف بھی اس کا موجب ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی مذہب میں یہ خصوصیت
ہے کہ وہ صرف اسی وقت اس کا موجب ہوتا ہے جبکہ لوگ مذہب کی حقیقت سے دُور جا
پڑتے ہیں جیسا کہ مثلاً ہمارے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں یہود اور مشرکین عرب نے مذہب کی
حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے محض ظلم اور تعدی کے طور پر بے گناہ مسلمانوں کے خلاف جنگ برپا
کر دیا۔ اور پھر مسلمانوں کو بھی خود حفاظتی اور قیام امن کی غرض سے تلوار کا جواب تلوار سے دینا
پڑا۔ اور اس طرح ملک میں جنگ کی صورت پیدا ہو گئی جس کے ذمہ وار کلیتہً مذہب کی حقیقت
اور غرض وغایت کو نہ سمجھنے والے مشرکین ویہود تھے اور مسلمانوں کیطرف سے یہ جنگ صرف قیام
امن کی وجہ سے تھا۔ الغرض یہ ایک نہایت ہی لغو اور بیہودہ خیال ہے کہ مذہب جنگ اور
فتنہ کا موجب ہوتا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ مذہب ہی وہ طاقت ہے جو کما حقہ فتنہ وفساد کا
سدباب کر سکتی ہے اور مذہب کی حقیقت سے دُور ہونا امن شکنی اور فتنہ کا باعث ہو
جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جاوے کہ مذہبی اختلاف جنگ و
جدال کا موجب ہوتا ہے تو پھر بھی معترضین کو یہ حق نہیں کہ اس بنا پر مذہب سے روگردانی کریں
کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دُنیا میں بہت سی اور باتیں امن شکنی اور جنگ وجدال

کا موجب ہوتی رہتی ہیں مگر کوئی عقلمند ایسا نہیں جو اس وجہ سے انکے ترک کرنے کا خیال دل میں لاوے۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ ہر اک اختلاف جس کا غلط استعمال کیا جاوے بد نتائج پیدا کریگا اور اس میں مذہب کی قطعاً کوئی خصوصیت نہیں۔ سیاسی اور ملکی اختلافات کا غلط استعمال جنگ پیدا کریگا۔ قومی اختلافات کا غلط استعمال جنگ پیدا کریگا۔ تجارتی اور اقتصادی اختلافات کا غلط استعمال جنگ پیدا کریگا۔ اسی طرح مذہبی اختلافات کا غلط استعمال جنگ پیدا کریگا۔ صرف فرق یہ ہے کہ باقی باتیں گو غلط استعمال میں آنے سے امن شکنی کا موجب تو ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کا صحیح استعمال خاص طور پر قیام امن اور باہم تعاون و اخوت کے جذبات پیدا کرنیکا موجب نہیں ہوتا۔ لیکن مذہب جب وہ اپنی اصلی شکل و صورت میں رہے اور لوگ اس کا صحیح استعمال کریں خصوصیت کے ساتھ امن اور تعاون اور وحدت اور اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ حق یہی ہے چاہو تو قبول کرو۔

چوتھا جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ معترضین نے مذہب کے معنے سمجھنے میں بھی غلطی کھائی ہے انہوں نے غالباً یہ سمجھ رکھا ہے کہ مذہب صرف خدا کے عقیدہ کا نام ہے اور جب کسی نے یہ عقیدہ ترک کر دیا۔ تو اس نے گویا مذہب کو چھوڑ دیا۔ گویا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جسے انسان چھوڑ بھی سکتا ہے حالانکہ گو عرفی طور پر خدا کے عقیدہ کا تارک لامذہب کہلاتا ہے لیکن اگر مذہب کے معنوں پر غور کیا جاوے تو پتہ لگتا ہے کہ مذہب انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے اور انسان کے لئے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ مذہب کی قید سے مطلقاً آزاد ہو سکے۔ کیونکہ درحقیقت مذہب ان خیالات و عقائد اور طریق عمل کا نام ہے جو انسان اپنی زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لحاظ سے کسی شخص کا مذہب سے الگ ہونا محالات عقلی سے ہے کیونکہ ہر شخص کوئی نہ کوئی طریق زندگی رکھتا ہے۔ پس یہ سوال تو پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم یہ مذہب پسند نہیں کرتے یا وہ مذہب پسند نہیں کرتے۔ لیکن یہ بات کہ انسان مطلقاً مذہب سے آزاد ہو جائے قطعاً ناممکن ہے جب تک انسان زندہ ہے اسے اپنے گردوپیش کی چیزوں کے متعلق کچھ خیالات و عقائد

رکھنے پڑینگے اور اپنے اعمال وافعال میں کوئی طریق اختیار کرنا پڑیگا۔ اور یہی خیالات وعقائد اور طریق عمل اس کا مذہب کہلائے گا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کرسکتا ہے کہ جو معروف الہامی مذاہب ہیں ان سے منحرف ہوجائے اور اپنے لئے خود اپنے دماغ سے کوئی طریق نکال لے لیکن ایسا شخص مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے جو ابھی ہم نے بیان کی ہے حقیقتاً لا مذہب نہیں کہلا سکتا بلکہ جو طریق وہ اپنے لئے پسند کریگا وہی اس کا مذہب ہوگا۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہے تو یہ اس کا مذہب ہے۔ اور اگر انکار کرتا ہے تو یہ بھی اسکے مذہب کا حصہ ہے۔ الغرض مذہب زندگی کے طریق عمل اور ان عقائد وخیالات کا نام ہے جو انسان اختیار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان معنوں کے لحاظ سے مذہب سے آزاد ہونا کسی شخص کے لئے ممکن نہیں۔ تم اسلام سے آزاد ہو سکتے ہو۔ عیسائیت سے آزاد ہوسکتے ہو۔ ہندوازم سے ہوسکتے ہو بدھ ازم سے ہوسکتے ہو اور ہر دوسرے معروف الہامی مذہب سے آزاد ہوسکتے ہو لیکن مذہب کوئی نہ کوئی تمہیں ضرور رکھنا پڑیگا خواہ وہ تمہارے اپنے دماغ کا ہی بنایا ہؤا کیوں نہ ہو۔ تم خدا کو یا تو مانوگے یا انکار کروگے اگر مانوگے تو اسکی کوئی نہ کوئی صفات بھی تسلیم کروگے۔ اگر انکار کروگے تو اس عالم کی ابتداء اور حیات کے آغاز کے متعلق تمہیں کوئی عقیدہ قایم کرنا پڑے گا۔ پھر مختلف لوگوں یعنی دوست دشمن رشتہ دار۔ غیر رشتہ دار۔ خادم۔ آقا۔ بادشاہ۔ رعایا وغیرہ وغیرہ کے ساتھ معاملہ کرنے میں تمہیں کوئی نہ کوئی طریق عمل اختیار کرنا ہوگا اور یہی خیالات وطریق عمل تمہارا مذہب کہلائے گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ مذہب زندگی کے ساتھ لازم ملزوم کے طور پر ہے اور کوئی شخص مذہب کی قید سے مطلقاً آزاد نہیں ہوسکتا۔ اور یہ جو بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص لامذہب ہے اس کے صرف یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ کسی معروف الہامی مذہب کا پیرو نہیں بلکہ اس نے اپنا مذہب تو آپ بنایا ہؤا ہے ورنہ حقیقتاً کوئی شخص بھی لامذہب نہیں ہوتا

اب جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہب کی قید سے آزاد ہونا ناممکنات سے ہے۔ تو پھر معترضین کا یہ اعتراض کہ چونکہ مذہب جنگ وجدال اور تنگ خیالی پیدا کرتا ہے اس لئے انسان کو اس سے آزاد ہوجانا چاہیئے ایک لایعنی بلکہ مضحکہ خیز بات قرار پاتی ہے جو کسی عقلمند کے مُنہ پر نہ آنی چاہیئے۔ اور اگر یہ کہا جاوے کہ اس اعتراض سے مراد یہ ہے کہ معروف الہامی

مذاہب سے آزاد ہو جانا چاہیئے تو یہ ایک جہالت کی بات ہوگی۔ کیونکہ یہاں یہ بحث نہیں کہ فلاں مذہب فتنہ و فساد پیدا کرتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ مطلقاً مذہب فتنہ و فساد کا موجب ہے۔ ورنہ اگر کوئی خاص مذہب واقعی فتنہ اور امن شکنی کا موجب بنتا ہے تو ہم کب کہتے ہیں کہ اسے اختیار کرو۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ مذہب فتنہ اور جنگ کا موجب ہے۔ اور اگر یہ بات درست بھی ہو تو پھر بھی چونکہ ہم کسی صورت میں بھی مذہب سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مذہب سے آزاد ہونے کا سوال اُٹھانا ہی فضول اور لغو ہے۔ علاوہ ازیں اگر بفرض محال لوگ الہامی مذاہب کی پیروی سے آزاد بھی ہو جائیں پھر بھی ان کے اندر مذہبی اختلافات موجود رہیں گے کیونکہ یہ بالکل قرینِ قیاس نہیں کہ ان مذاہب سے آزاد ہو کر سب لوگ اپنے واسطے ایک سے خیالات و عقائد اور ایک سا طریقِ عمل مقرر کر لیں بلکہ اس صورت میں دُنیا میں مذاہب کی تعداد یقیناً موجودہ تعداد سے بھی بہت زیادہ بڑھ جائیگی یعنی اب اگر دنیا میں صرف پانچ دس یا پندرہ بیس مذاہب پائے جاتے ہیں تو اس وقت غالباً ہزاروں لاکھوں مذاہب پیدا ہو جائینگے اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ تعداد کروڑوں تک جا پہنچے کیونکہ ہر شخص آزاد ہو کر اپنے لئے اپنے مطلب کا مذہب بنانا چاہے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تعداد کی زیادتی کے ساتھ ہی اختلافات کی کثرت بھی غیر معمولی طور پر ظاہر ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب اگر مذہبی اختلاف گاہے گاہے لڑائی جھگڑے کا موجب ہوتا ہے تو اس صورت میں آئے دن مذہب کے نام پر فتنہ و فساد اور خون خرابا ہُوا کرے گا اور اگر یہ کہا جاوے کہ فتنہ و فساد اور تنگ خیالی کا موجب صرف الہامی مذاہب ہو سکتے ہیں جن کا مرکزی نقطہ خدا کی ذات اور قیامت و جزا سزا کا عقیدہ ہیں کیونکہ ہر فرقہ اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر ناجی اور جہنمی قرار دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن غیر الہامی مذاہب جو انسان خود اپنے لئے آپ سوچکر بناتا ہے وہ اس تفرقہ اور باہم نفرت و حقارت کا موجب نہیں ہو سکتے خصوصاً جبکہ خدا کا خیال درمیان میں نہ آئے اور نہ جزا سزا کا کوئی خیال ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف ہے۔ دوسرے کو خطرہ

کی حالت میں دیکھنے کا طبعی اور فطرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اسکے بچانے کے واسطے کوشش کا خیال دل میں آتا ہے اور یہ بالکل غیر طبعی ہے کہ ایسے موقعہ پر نفرت و حقارت کے خیالات پیدا ہوں۔ پس اگر مختلف فرقہ جات اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو غیر ناجی اور جہنمی سمجھتے ہیں تو اس کا طبعی اور فطری نتیجہ یہ ہونا چاہئیے کہ وہ دوسروں کے لئے دردمند ہوں اور ان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے اپنی پوری کوشش اور سعی سے کام لیں۔ اور اس صورت میں نفرت و حقارت و عداوت کا پیدا ہونا بالکل بیرون از سوال ہے۔ کیا اگر کوئی شخص کسی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دریا میں ڈوبتا ہوا دیکھے تو اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ شخص قابلِ نفرت و حقارت ہے اور مجھے اس سے عداوت کرنی چاہیئے یا یہ کہ وہ فوراً پانی میں کود کر اس کے بچانے کی کوشش کریگا؟ اور اگر وہ شخص کنارے پر کھڑا رہے گا اور اس ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے کے لئے باوجود طاقت رکھنے کے ہاتھ پاؤں نہ ماریگا بلکہ اُلٹا خوش ہوگا اور ڈوبنے والے کو قابلِ نفرت و حقارت سمجھنے لگیگا اور بجائے اسے بچانے کی کوشش کرنے کے یہ کوشش کریگا کہ اگر ہو سکے تو میں اسے اور بھی کسی طرح نقصان پہنچاؤں تو وہ ایک انسانیت سے گرا ہوا شخص سمجھا جاویگا اور اسکی فطرت مُردہ قرار دی جاویگی۔ اسی طرح جو شخص اپنے مذہب کو نجات کا رستہ سمجھنے کی وجہ سے دوسروں سے نفرت و حقارت کرتا ہے اور ان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے وہ ایک غیر فطری فعل کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسے شخص کے متعلق کبھی بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ مذہب کی حقیقت پر قائم ہے اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مذہب کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور مذہب کی رُوح انکے اندر نہیں پائی جاتی وہی اس قسم کی خلاف فطرت باتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ والّا مذہب کی حقیقت کو سمجھنے والے لوگ غلط راستہ پر چلنے والوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کو گمراہی اور ہلاکت سے بچانیکی کوشش میں رہتے ہیں اور نفرت و عداوت کا خیال تک بھی کبھی انکے دل میں نہیں آتا۔ علاوہ ازیں یہ نہیں سوچا گیا کہ مذہب کے انعامات اور افضال مادی مال کیطرح نہیں ہیں کہ ان کا وارث اسبات سے خائف ہو کہ اگر وہ کسی دوسرے کو مل گئے تو میں اس سے محروم ہو جاؤنگا بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو

دوسروں کو سکھانے سے ترقی کرتی اور بڑھتی ہے اور اسی لئے ایک مذہبی آدمی اسبات کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسکے مذہب کو قبول کرکے انعامات کے وارث بنیں۔خلاصہ کلام یہ کہ کسی جہت سے بھی دیکھا جاوے خدا کا عقیدہ یا مذہب کا تعلق کسی صورت میں بھی تنگ خیالی اور فتنہ وفساد کا موجب نہیں ہوسکتا۔اور اگر کوئی شخص باوجود ایک مذہبی آدمی کہلانے اور خدا پر ایمان لانے کا دعویٰ رکھنے کے تنگ خیالی اور مذہب کے نام پر فتنہ وفساد کا موجب ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ومحبت کے جذبات نہیں رکھتا بلکہ کینہ وعداوت کے خیالات رکھتا ہے اور تنگ دل اور تنگ ظرف ہے تو وہ ہرگز ہرگز حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی نہیں کہلاسکتا۔اور اس کا جسم یقیناً مذہب کی مقدس روح سے اسی طرح خالی ہے جس طرح ایک اُجڑا ہوا مکان مکین سے خالی ہوتا ہے اور اس کا خدا پر ایمان لانے کا دعویٰ ایک صرف زبانی دعویٰ ہے جسکے اندر کچھ بھی حقیقت نہیں۔مگر بدقسمتی سے اس قسم کے بے مایہ لوگ آجکل ہر ملت میں کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور اسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور اسی وجہ سے معترضین کو اعتراض کرنیکا موقعہ ملا ہے مگر حقیقی طور پر مذہبی آدمی جو مذہب کی حقیقت کو سمجھتا ہے کبھی بھی تنگ ظرف اور فتنہ وفساد کا موجب نہیں ہوسکتا۔یہ درست ہے کہ ایک حقیقی مومن باللہ کے ہاتھ سے بھی بعض اوقات دوسروں کو تکلیف پہنچ جاتی ہے لیکن وہ تکلیف ایسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ ایک مہربان ڈاکٹر اپنے مریض کو ایک کڑوی دوا پینے یا کسی بظاہر تکلیف دہ پرہیز کے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے اور بیشک ایک روحانی آدمی بھی بعض اوقات دوسروں کے خلاف جنگ میں حصہ لیتا اور بعض لوگوں کے قتل کئے جانے کا موجب ہوجاتا ہے لیکن اس کا یہ فعل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک ہمدرد جرّاح کسی ایسے بیمار کا کوئی عضو کاٹ کر الگ کردیتا ہے جسکے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کا یہ عضو کاٹ نہ دیا گیا تو اسکی جان ضائع ہوجائیگی۔پس وہ ایک دردمند دل کے ساتھ زیادہ قیمتی چیز کے بچانے کیلئے کم قیمتی چیز کو قربان کردیتا ہے اور سب عقلمند لوگ اسکے اس فعل کو قابل تحسین خیال کرتے ہیں۔میرے عزیزو میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ خدا کے رسول اور پاک بندے بھی جب کسی شخص یا گروہ کے خلاف ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو انکے قلب صافی میں بھی اس پاک نیت کے سوا اور کوئی خیال

نہیں ہوتا۔ اور ان کا دل ایک لبریز چشمہ کیطرح محبت و ہمدردیٔ بنی نوع آدم کے جذبات سے ہر وقت معمور رہتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور ابدی حقیقت ہے جسکی تصدیق خدا کے پاک بندوں میں ہر زمانہ میں ملتی ہے۔ کاش تم سمجھو +

عرض حال

اس مضمون کو آگے چلانے سے قبل میں ایک مختصر سی عرض حال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مینے یہ مضمون سنہ ۱۹۲۵ء کے ماہ جون میں قادیان میں شروع کیا تھا۔ اور اس کا ابتدائی حصہ اسی موسم گرما میں منصوری میں تحریر کیا جہاں مجھے ڈاکٹری مشورہ کے ماتحت جانا پڑا اس کے بعد جب میں قادیان واپس حاضر ہوا تو باقی حصہ سنہ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں اور کسی قدر سنہ ۱۹۲۶ء میں آہستہ آہستہ ضبط تحریر میں آیا۔ اور اسکے بعد حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ بنصرہ کے حکم کے ماتحت مجھے دفتر تالیف و تصنیف سے فارغ ہو کر نظارت تعلیم و تربیت کا چارج لینا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مضمون جس حد تک لکھا ہوا تھا اسی حد تک رہکر آجکے دن تک جو ابتدائے اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء ہے نامکمل پڑا رہا۔ کیونکہ میرے نئے فرائض نے اسکی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں دی۔ لیکن اب مجھے یہ خیال آیا اور نیز بعض دوستوں کیطرف سے بھی یہ تحریک کیگئی ہے کہ جس حد تک بھی لکھا جاچکا ہے اسے چھپوا دینا چاہیئے اور اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ مضمون مکمل ہو تو تب شائع کیا جاوے۔ سو میں اس سوال کی بحث کو جو مینے اسوقت شروع کیا ہوا ہے اور جو خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق عقلی دلائل سے تعلق رکھتا ہے مختصر طور پر چند صفحات میں ختم کر کے مضمون کو سپرد طابع کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس مضمون کو لوگوں کی ہدایت و اصلاح کا موجب بنائے اور مجھے اس کے بقیہ حصص کی تکمیل کی توفیق عطا کرے آمین

دراصل اس مضمون میں میرا ارادہ یہ تھا کہ خداوند قدوس کی ذات و صفات کے متعلق تمام سوالات کو مختصر طور پر زیر بحث لایا جاوے یعنی اسکی ہستی کے ہر دو قسم کے دلائل بھی ہوں اسکی صفات کی بحث بھی ہو اسکے ساتھ تعلق پیدا کرنیکے فوائد بھی تحریر کئے جاویں۔ اسکے ساتھ تعلق پیدا کرنیکے طریق بھی بیان ہوں۔ اور یہ بھی بتایا جاوے کہ اسکے تعلق کی کیا کیا علامات ہیں۔ مگر جیسا کہ ناظرین نے دیکھا ہے مینے ابھی پہلے سوال کا پہلا حصہ بھی جو خدا کی ذات کے متعلق عقلی دلائل سے تعلق رکھتا ہے ختم نہیں کیا۔ گویا پانچ سوالات میں سے ابھی تک نصف سوال بھی ختم نہیں ہو سکا۔ اور زیادہ

افسوس یہ ہے کہ مضمون کا زیادہ اہم اور ضروری حصہ وہ ہے جو بقیہ سیاحت سے تعلق رکھتا ہے مگر اب جو بھی ہے ہدیہ ناظرین ہے اور بقیہ کے لئے درخواست دعا ہے اور بس ۔

خدا کا عقیدہ بدی کے ارتکاب سے روکتا ہے

دوسرا بڑا فایدہ جو خدا پر ایمان لانے کے نتیجہ میں دُنیا کو عمومی طور پر حاصل ہو سکتا ہے یہ ہے کہ ایمان باللہ انسان کو بدی کے ارتکاب سے روکتا ہے ظاہر ہے کہ گناہ اور جرم سے رُکنے کا خیال انسان کو امکاناً تین طرح ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ انسان کو یہ خیال ہو کہ اگر میں بدی سے باز رہا تو مجھے اسکے بدلے میں کوئی فائدہ پہنچے گا یا کوئی انعام حاصل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں گناہ کا مرتکب ہُوا تو مجھے اس کے بدلے میں کوئی تکلیف پہنچے گی یا کوئی سزا بھگتنی پڑیگی۔ اور تیسرے یہ کہ کسی شخص کا علم وعرفان ہی ایسا ترقی کر جاوے کہ وہ بدی سے محض اس وجہ سے اجتناب کرے کہ وہ بدی ہے۔ ان تینوں روکوں کے علاوہ اور کوئی روک انسان کے لئے گناہ اور جرم سے باز رہنے کی ہرگز نہیں ہے اور ان تینوں میں سے بھی تیسری روک ایسی ہے کہ وہ خاص خاص لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور عامۃ الناس اس سے متاثر نہیں ہوتے اور گو اس تیسری روک سے فائدہ اُٹھانے میں بھی ایک مومن باللہ ایک غیر مومن پر یقیناً فوقیت رکھتا ہے۔ مگر باقی دو روکیں تو بالبداہت ایسی ہیں کہ خدا کا عقیدہ ان میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے کیونکہ جو کوئی بھی خدا پر ایمان لاتا ہے وہ ساتھ ہی اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ اگر میں نے بدی کا ارتکاب کیا تو خدا تعالےٰ مجھ پر ناراض ہوگا۔ اور اس ناراضگی کے نتیجے میں مجھے تکلیف پہنچے گی۔ یا کوئی سزا بھگتنی پڑیگی اور اگر میں بدی سے مجتنب رہا تو خدا مجھ پر خوش ہوگا اور اسکی خوشنودی میرے فائدہ کا موجب ہوگی اور مجھے انعام واکرام کا حقدار بنائیگی پس اس خیال کے ماتحت ہر وہ شخص جو خدا پر ایمان لاتا ہے اور اس کا ایمان کچھ بھی حقیقت رکھتا ہے یقیناً دوسروں کی نسبت گناہ سے زیادہ بچا ہُوا ہوگا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہوئے بدی کے ارتکاب کیطرف جرأت کے ساتھ قدم بڑھائے۔ بلکہ جتنا جتنا کوئی شخص اپنے ایمان میں زیادہ پختہ اور زیادہ کامل ہوگا اتنا ہی وہ گناہ اور جرائم سے زیادہ دُور اور زیادہ متنفر رہے گا۔ علاوہ ازیں خدا

کا عقیدہ اس لحاظ سے بھی انسان کو بدی کے ارتکاب سے روکتا ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا پر ایمان لاتا ہے وہ ساتھ ہی خدا کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب بھی یقین کرتا ہے اور اس لئے اگر اس کا ایمان ذرا بھی حقیقت پر مبنی ہے اور محض ورثہ کا ایمان نہیں تو یقیناً یہ خیال کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے اسے بدی کے ارتکاب سے باز رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ہر وقت کوئی پولیس مین نہیں رہ سکتا۔ اور اسی لئے ملک کی سیاست خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ او مکمل ہو جرائم کے ارتکاب کو روکنے میں کبھی بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی اور صرف ایمان باللہ ہی وہ چیز ہے جو ہر شخص کے دل میں ہر وقت ایک ہوشیار و چوکس پولیس مین کا کام دے سکتی ہے کیونکہ کوئی شخص خدا پر ایمان لاتے ہوئے بشرطیکہ وہ ایمان کچھ بھی حقیقت اپنے اندر رکھتا ہو گناہ کیطرف دلیری کے ساتھ ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ اور اگر کبھی کسی غفلت کی حالت میں ایسا شخص گناہ کا مرتکب بھی ہو گا تو فوراً اس کا ایمان اسے نادم کر کے آئندہ کے لئے ہوشیار کر دیگا۔ الغرض خدا کا عقیدہ ایک قطعی اور یقینی ذریعہ گناہ اور جرائم سے روکنے کا ہے اور کوئی عقلمند انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ ایک نہایت عظیم الشان فائدہ ہے جو اس عقیدہ سے دنیا کو حاصل ہو سکتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ خدا پر ایمان لانے والے بھی تو بدی کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ بیشک خدا کا عقیدہ رکھنے والے لوگوں میں سے بھی بعض لوگ بعض اوقات بدی کے مرتکب ہو جاتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ لوگ وہی ہوتے ہیں جو اپنے ایمان میں کمزور اور سست ہوتے ہیں یا جن کا ایمان صرف ایک نام کا ایمان ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے ماں باپ سے ورثہ میں پایا ہوتا ہے اور اس کے اندر کچھ بھی حقیقت نہیں ہوتی۔ ورنہ حقیقی طور پر ایمان لانیوالے لوگ یقیناً گناہوں سے بہت بچے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ اس بات کا ایک مزید ثبوت ہے کہ ایمان باللہ گناہ سے روکتا ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ پختہ ایمان والے سست ایمان والوں کی نسبت بدی سے زیادہ بچے ہوئے ہوں بلکہ اگر دوسرے حالات برابر ہوں تو جتنا بھی کوئی شخص اپنے ایمان و عرفان میں ترقی یافتہ ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ گناہ سے پاک نظر آئے گا۔ الغرض یہ ایک بین حقیقت ہے جس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جسکی صداقت

پر ہر زمانہ میں مہر تصدیق لگتی چلی آئی ہے کہ خدا پر ایمان لانا بشرطیکہ اس ایمان میں کچھ بھی حقیقت ہو دنیا میں بدی کے سدباب کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے وھوالمراد - یہ بحث بہت مفصل طور پر بیان کیجا سکتی ہے لیکن اب چونکہ مَیں نے اس حصہ مضمون کو چند صفحات میں ختم کرنا ہے اس لئے اسی مختصر بیان پر اکتفا کرتا ہوں +

خدا کا عقیدہ نیکی کی طرف رغبت پیدا کرتا ہے

تیسرا بڑا فائدہ جو ایمان باللہ سے دُنیا کو حاصل ہو سکتا ہے یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ نیکی کیطرف رغبت پیدا کرتا ہے - اور اسبارت کو اسی قسم کے دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے جو مندرجہ بالا بیان میں مختصراً مذکور ہوئے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقلمند اس سے انکار کر سکے - لیکن اختصار کے خیال سے میں اس جگہ اس بحث کو چھوڑتا ہوں +

خدا کا عقیدہ حقائق الاشیا کی تحقیق میں ممد ہے

چوتھا بڑا فائدہ جو ایمان باللہ سے دنیا کو حاصل ہو سکتا ہے یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ حقائق الاشیا کی تحقیق میں بہت ممدّ و معاون ہے - ظاہر ہے کہ جو شخص اس دُنیا کو بغیر کسی خالق و مالک کے یقین کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ دُنیا محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہے یا یہ خیال کرتا ہے کہ کسی ابتدائی سادہ اور ادنی حالت سے جسکے آغاز کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا - یہ سارا کارخانہ عالم آہستہ آہستہ ارتقا کے اندھے قانون کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و صورت کو پہنچا ہے وہ کبھی بھی حقائق الاشیاء اور قانونِ نیچر کی دریافت میں اس شوق و ذوق اور امید کے ساتھ منہمک نہیں ہو سکتا جو اس معاملہ میں ایک مومن باللہ کو حاصل ہو سکتے ہیں - ایک خدا پر ایمان لانیوالے شخص کا دل اس یقین و ایمان سے پُر ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میرے خدا کی پیدا کردہ ہے اور یہ کہ خدا نے ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کیا ہے اور اس لئے دنیا کی کوئی چیز بھی عبث اور باطل نہیں بلکہ اپنی اپنی خلقت کی غرض و غایت کے ماتحت اپنے اپنے مفوضہ کام کو سرانجام دے رہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ یقین حقائق الاشیاء کی تحقیق کے معاملہ میں انسان کے اندر ایک خاص شوق و ذوق

اور امید و رجا کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو بغیر اس کے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور یہ کیفیت دنیا کی علمی ترقی کے لئے ایک عظیم الشان سہارے کا کام دیتی ہے بمقابلہ اس کے اگر ایک شخص خدا کا منکر ہے اور اس دُنیا کو محض اتفاق کا نتیجہ قرار دیتا ہے تو وہ کبھی بھی حقائق الاشیاء کی دریافت میں اس شوق اور امید کے ساتھ منہمک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنے عقیدہ کے ماتحت اس بات کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک چیز صرف کسی اتفاقی تغیر کا نتیجہ ہو یا یونہی کسی اندھے قانون کے چکر میں آکر رونما ہو گئی ہو اور اگر کبھی ایسا شخص علمی ترقی کے خیال سے کسی چیز کے حقائق کی دریافت شروع بھی کرتا ہے تو پھر بھی وہ ہر گز اس استقلال و ہمت کے ساتھ اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا جو ایک مومن باللہ کو میسر ہو سکتے ہیں بلکہ اس کا دل ہر ناکامی پر اس طرف مائل ہونے لگے گا کہ اب کسی مزید کوشش اور توجہ کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ یہ خیال کرے گا کہ ممکن ہے کہ اس چیز میں کوئی خاص بات قابل دریافت ہو ہی نہیں لیکن ایک خدا پر ایمان لانے والا شخص خواہ کتنی بھی ناکامیاں دیکھے وہ اس یقین سے کبھی بھی متزلزل نہیں ہوگا کہ اس چیز میں ضرور کوئی خاص حکمت اور غرض و غایت ہے کیونکہ میرے خدا نے اسے یونہی عبث نہیں پیدا کیا اور اس یقین کے نتیجے میں وہ لازماً اپنی ہر ناکامی کو اپنی کوشش کی کمی یا طریق تحقیق کی غلطی کیطرف منسوب کرے گا۔ اور ہمت نہیں ہارے گا۔ الغرض یہ ایک بین حقیقت ہے کہ خدا کا عقیدہ دُنیا میں حقائق الاشیاء کی تحقیق میں ایک نہایت مضبوط سہارے کا کام دیتا ہے . . . . . اور اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ حقائق الاشیاء یعنی سائنس کے مختلف شعبوں کی تحقیق میں خدا کو ماننے والے اور نہ ماننے والے سب ایک ہی طرح دلچسپی لیتے ہیں اور خدا کا عقیدہ اس معاملہ میں ہرگز کوئی امتیاز نہیں پیدا کرتا بلکہ برخلاف اسکے اس قسم کے محققین زیادہ تر یورپ و امریکہ میں پائے جاتے ہیں جہاں دہریت کے خیالات بلادِ مشرقی کی نسبت زیادہ رونما ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال ایک سراسر دھوکے پر مبنی ہے کیونکہ یورپ و امریکہ کے لوگ مذہباً دہریہ نہیں ہیں بلکہ خدا کو مانتے ہیں اور خواہ ان کا ایمان کیسا ہی ناقص اور کمزور سمجھا جاوے وہ بہر حال خدا کے مُنکرین میں سے نہیں سمجھے جا سکتے۔ اور یہ بات انکے مسلّمہ معتقدات میں داخل ہے کہ ہر چیز خدا کی پیدا کردہ ہے پس فی زمانہ

حقائق الاشیار کے علم میں ان کا بڑھا ہُوا ہونا ہرگز موجب اعتراض نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا یہ امر
ان میں دہریوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے سو یہ بھی ایک خیال ہی خیال ہے کیونکہ جبتک اعداد و
شمار سامنے نہ ہوں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بالکل ممکن ہے کہ بلاد مشرقی میں مغرب کی
نسبت دہریہ خیال کے لوگ زیادہ ہوں۔ بہرحال جبتک کوئی بات ثابت نہ ہو اس پر کسی
دعویٰ کی بُنیاد کیونکر رکھی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ چونکہ مغرب کے
لوگ ظاہری علوم میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں اس لئے انکے سارے خیالات خواہ وہ انفرادی ہوں
یا قومی۔ دنیا کے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مشرقی ممالک میں بوجہ تعلیم کی کمی کے
لوگوں کے انفرادی خیالات دُنیا کے سامنے بہت کم آتے ہیں اور علم النفس کے مسئلہ کے ماتحت
یہ بھی ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں مشرقی لوگ خود بھی اپنے خیالات کو اچھی طرح نہ سمجھتے ہوں کیونکہ
تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں میں ذہنی محاسبہ کی عادت بہت کم ہے پس بالکل ممکن ہے کہ
باوجود دہریت کے خیالات سے متاثر ہونیکے وہ اپنی اس حالت کو عموماً محسوس نہ کرتے ہوں مگر
یورپ و امریکہ میں یہ بات نہیں کیونکہ وہاں تعلیم کی زیادتی کی وجہ سے ہر شخص ذہنی محاسبہ کی عادت
رکھتا ہے اور اس لئے اس کا ہر ذہنی تغیر اسکے سامنے آتا رہتا ہے۔ اندریں حالات یہ بات
ہرگز غیر ممکن نہیں کہ مغرب میں باوجود دہریوں کی تعداد تھوڑی ہونیکے وہ زیادہ نظر آتے ہوں اور
مشرق میں باوجود انکی تعداد زیادہ ہونیکے وہ تھوڑے نظر آتے ہوں۔ پس جبتک یہ ثابت نہ کیا
جاوے کہ یورپ و امریکہ میں دہریوں کی تعداد مشرقی ممالک کی نسبت سے واقعی زیادہ ہے اسوقت
تک صرف ایک عامیانہ اعتراض کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جاوے
کہ مغرب میں دہریوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے تو پھر بھی کوئی جائے اعتراض نہیں کیونکہ ہر وہ
شخص جو یورپ و امریکہ کی تاریخ کا ذرا بھی مطالعہ رکھتا ہے جانتا ہے کہ ان ممالک میں دہریت کے
خیالات انکی علمی ترقی کے آغاز کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ پس اگر بلادِ غربی میں دہریت کا اثر مشرق
کی نسبت واقعی زیادہ ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ علمی ترقی دہریت کا باعث
ہوئی ہے نہ یہ کہ دہریت کے اثر نے علمی ترقی کیطرف میلان پیدا کیا ہے۔ یا یہ کہ خدا کا انکار نہ
خدا پر ایمان لانیکی نسبت علمی ترقی کا زیادہ شوق پیدا کرتا ہے پس اعتراض بہرحال باطل ہُوا

اور اگر اس جگہ کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ پھر علمی ترقی دہریت کا کیوں باعث ہوئی ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ علمی ترقی حقیقتاً دہریت کا باعث ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کو ایک سخت دھوکا لگا ہے۔ جسکی وجہ سے انہوں نے ایک سراسر غلط نتیجہ نکال لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ علمی ترقی کے نتیجہ میں لازماً ایک بیداری پیدا ہوتی ہے اور وہ جمود جو جہالت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ زندگی کی حرکت سے بدلنا شروع ہو جاتا ہے اور اس حرکت کے نتیجے میں بعض لوگ جن کا ذہنی نشوونما صحیح طور پر ترقی یافتہ نہیں ہوتا۔ یا جو گردوپیش کے حالات سے متاثر ہو کر۔ یا کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر غلط رستہ پر چل پڑتے ہیں انکے واسطے یہی بیداری اور یہی زندگی کی حرکت ٹھوکر کا موجب جاتی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں جہالت اور لاعلمی کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے لوگ چونکہ بوجہ اپنے جمود کے ایک ہی جگہ ٹھہرے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کو غلط راستہ پر پڑنے کا کوئی موقعہ پیش ہی نہیں آتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں | وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہسوار کی شہسواری اسے گراتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ شہسوار کو گرنے کے موقع پیش آتے رہتے ہیں اس لئے وہ کبھی کبھی گر جاتا ہے۔ پس اگر یورپ وامریکہ میں دہریت کا اثر زیادہ ہے تو اسکی سوائے اس بات کے اور کوئی وجہ نہیں کہ علمی ترقی نے انکی جمود کی حالت کو زندگی کی حرکت سے بدل دیا ہے۔ یعنی پہلے وہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے ایک ہی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے مگر اب ہوشیار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور چلنے پھرنے لگ گئے ہیں جسکے نتیجہ میں لازماً وہ اگر ترقی کر رہے ہیں تو ان میں سے بعض لوگ بھٹک بھی رہے ہیں ٹھوکریں بھی کھاتے ہیں گرتے بھی ہیں مگر، ظاہر ہے کہ یہ علم کا قصور نہیں اور نہ علم اس کا باعث ہے بلکہ یہ علم کے غلط استعمال کا جس میں بعض لوگ مبتلا ہو جایا کرتے ہیں ایک طبعی نتیجہ ہے لیکن اسکے مقابل میں جو قوم مطلقاً علم کا استعمال ہی نہیں کرتی وہ جیسا کہ صحیح استعمال کی برکات سے محروم ہوتی ہے اسی طرح غلط استعمال کے بدنتائج سے بھی محفوظ رہتی ہے اور یہی حال اسوقت یورپ وامریکہ کے مقابلہ میں بلاد مشرقی کا ہے۔ پس بہر حال یورپ وامریکہ

کی حالت کو ہمارے دعویٰ کی تردید میں پیش کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا یہ سوال کہ دہریوں میں بھی حقائق الاشیاء کی تحقیق کا شوق رکھنے والے کیوں پائے جاتے ہیں سو اس کا یہ جواب ہے کہ ہم نے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس قسم کی علمی تحقیق کا شوق صرف خدا کے عقیدہ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اور دنیا کی اور کوئی چیز اس کا باعث نہیں ہوتی بلکہ ہم تو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دُنیا میں بہت سی چیزیں اس قسم کا شوق اور میلان پیدا کرنیکا موجب ہوتی ہیں۔ پس اگر ایک دہریہ دوسرے موجبات سے متاثر ہو کر اس شوق میں لگ جاوے تو ہرگز قابل اعتراض نہیں۔ ہمارا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ حقائق الاشیاء کی تحقیق میں خاص طور پر ممد و معاون ہوتا ہے۔ اور اگر دوسرے حالات برابر ہوں تو ایک مومن باللہ یقیناً ایک کافر باللہ کی نسبت حقائق الاشیاء کی دریافت میں زیادہ طبعی جوش رکھنے والا۔ زیادہ شائق۔ زیادہ پُر امید۔ زیادہ مستقل مزاج اور زیادہ باہمت ثابت ہوگا۔ کیونکہ وہ دنیا کی ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا شدہ یقین کرتا ہے اور دہریہ کو یہ یقین حاصل نہیں۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔

خدا کا عقیدہ اطمینانِ قلب پیدا کرتا ہے

پانچواں بڑا فائدہ جو خدا کے عقیدہ سے دُنیا کو حاصل ہو سکتا ہے یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانا انسان کے دل میں ایک اطمینان کی حالت پیدا کر دیتا ہے اور یہ اطمینانِ قلب زندگی کے ہر شعبے میں انسان کے کام آتا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی ایسا نہیں جو اطمینانِ قلب کے بغیر خیر و خوبی کے ساتھ سر انجام پا سکے۔ ایک دہریہ کا دل ہمیشہ بے اطمینانی اور بے چینی اور عدم یقین کے خیالات کا شکار رہتا ہے اور اسے کبھی بھی اپنی حالت پر بشرطیکہ وہ ایک صاحب شعور اور مذہبی مذاق کا آدمی ہو اطمینان نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر وقت اسکے دل میں ایک دُبدہ اور خلش لگی رہتی ہے کہ ممکن ہے کہ میری تحقیق غلط ہو اور میرے اوپر واقعی کوئی خالق و مالک موجود ہو۔ دراصل دہریت چونکہ حقیقتاً ایک محض منفی علم ہے اور اسکی بُنیاد کسی حقیقی اثباتی دلائل پر واقع نہیں۔ یعنی عموماً ایک دہریہ یہ نہیں کہتا۔ اور نہ کہہ سکتا ہے کہ مینے یقیناً معلوم کر لیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے بلکہ وہ صرف

اس حد تک رہتا ہے کہ میرے پاس خدا کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور نیز اسکی فطرت بھی اپنی گہرائیوں میں دہریت کو قبول نہیں کرتی۔ اس لئے اسکے دل میں اپنے اس عقیدے کے متعلق یقین اور اطمینان کی حالت کبھی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اور اسکی فطرت اور نورِ عقل اور گرد و پیش کے حالات اسکے دل میں ایک بے چینی کی کیفیت پیدا رکھتے ہیں اور یہ بے چینی اسکی زندگی کو مضطرب اور اسکے خیالات کو پریشان کر دیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی کام میں بھی یکسوئی اور اطمینان نہیں پاتا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں خدا کا عقیدہ چونکہ ایک زبردست اثباتی بنیاد پر قایم ہے اور فطرت انسانی بھی اس میں اطمینان پاتی ہے۔ اس لئے ایک مومن باللہ کو ہمیشہ جمعیت خاطر اور یکسوئی حاصل رہتی ہے اور اسکے لئے کوئی حالتِ منتظرہ باقی نہیں رہتی جو اسے پریشان رکھے۔ اور وہ اپنے ہر کام میں اپنی حالتِ مطمئنہ سے فائدہ اُٹھاتا ہے علاوہ ازیں ایک دہریہ کو یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید کوئی خدا ہو اور میں اس کا انکار کر کے یونہی نقصان اُٹھاؤں۔ اور یہ اندیشہ اسکے دل کو مضطرب رکھتا ہے لیکن اگر ایک مومن باللہ کو یہ خیال پیدا بھی ہو کہ شاید کوئی خدا نہ ہو تو پھر بھی اسکے اندر کوئی اضطراب پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر کوئی خدا نہ ہوا تو پھر بھی میرے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ الغرض جس طرح بھی دیکھا جاوے خدا کا عقیدہ اطمینانِ قلب کا موجب ہوتا ہے اور خدا کا انکار بے چینی اور پریشانی اور عدم یقین کا باعث۔ اور اسی لئے قرآن شریف فرماتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ یعنی اے لوگو اس بات کو خوب اچھی طرح سُن لو کہ دل کا اطمینان صرف خدا کے ذکر سے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ انسان کے ہر کام میں اطمینانِ قلب کی ضرورت ہے اور دُنیا کا کوئی کام بھی ایسا نہیں جو اس اطمینان کے بغیر کامل طور پر سرانجام پا سکے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ خدا کا عقیدہ اس رنگ میں بھی دنیا کی ترقی و بہبودی میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے۔ +

خدا کے عقیدہ سے اخلاق کا معیار قایم ہوتا ہے

چھٹا بڑا فائدہ جو خدا پر ایمان لانے کے نتیجے میں دُنیا کو حاصل ہو سکتا ہے یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ دُنیا میں اخلاق کا معیار قایم کرنے کا موجب ہے۔ جو اس کے بغیر کبھی بھی قایم نہیں ہو سکتا۔ علم الاخلاق جسے انگریزی میں ETHICS

کہتے ہیں اس کے جاننے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اخلاق کا کوئی معیار قایم کرنا کس قدر مشکل کام ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس فن کے ماہرین نے بڑی بڑی بحثیں کرکے اور بڑی دماغ سوزی کے بعد جو تعریف نیکی کی کی ہے اور جو معیار اخلاق کا قایم کیا ہے اس میں اس قدر اختلاف ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ اور سب ایک دوسرے پر اعتراض کرتے ہیں اور نتیجہ دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اگر ہم ایمان باللہ کے دایرہ میں داخل ہو کر غور کریں تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان خود بخود اپنے آپ نہیں ہے کہ اسکے اخلاق کے معیار کے لئے ہمیں اپنی طرف سے کسی سوچ بچار اور غور و فکر کی ضرورت ہو۔ اور ہم اس بات کی تلاش میں اپنی توجہ صرف کریں کہ اسکے لئے کونسا فعل اور کونسا طریق اچھا سمجھا جانا چاہیئے۔ بلکہ وہ ایک بالا ہستی کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں انسان کے لئے اس بالا ہستی کے سوا اور کوئی نمونہ قابلِ تقلید نہیں ہو سکتا اور اسکے اخلاق کا معیار سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کی صفات کے رنگ میں رنگین کرے چنانچہ اسلام فرماتا ہے تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اے لوگو تم اپنے اخلاق کو خدا کے اخلاق کے مطابق بناؤ اور اسی لئے اسلام یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات کا ظل بنا کر پیدا کیا ہے اور جملہ صفات (سوائے ان صفات کے جو اُلوہیت کے لئے مخصوص ہیں) انسان کی فطرت کے اندر ایک چھوٹے اور محدود پیمانہ پر بطور تخم کے ودیعت کر دی ہیں اور پھر ان فطری تخموں کی صحیح آبپاشی اور صحیح پرورش اور ترقی کے لئے اس نے اپنے پاک بندوں کے ذریعہ اپنی طرف سے وقتاً فوقتاً ایک ضابطہ عمل نازل فرمایا ہے جسے شریعت کہتے ہیں اور یہی وہ معیار اخلاق ہے جو دُنیا کی حقیقی اصلاح اور ترقی کا موجب ہو سکتا ہے اور اسکے بغیر کوئی اور معیار تلاش کرنا اپنی محنت کو ضایع کرنا ہے۔ خوب سوچ لو کہ اخلاق کا کوئی صحیح معیار اسکے بغیر قایم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انسان اپنے خالق و مالک کی صفات و اخلاق کے ساتھ اپنے آپ کو متصف کرے جسکی عملی صورت یہ ہے کہ جو فطری جذبات انسان کے اندر پائے جاتے ہیں اور جو خود اپنی ذات میں خدا کی ہستی کی ایک دلیل ہیں کیونکہ وہ خدا کی صفات کا ظل ہیں ان کا بموجب احکام شریعت صحیح استعمال کرکے خدا کے رنگ میں رنگین ہونے کی کوشش کیجاوے مثلاً

محبت ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا صحیح استعمال یعنی ایسا استعمال جو خدا کے رنگ میں انسان کو رنگین کر دے ایک اعلیٰ خلق ہے۔ وفاداری ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا صحیح استعمال ایک اعلیٰ خلق ہے رحم ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا صحیح استعمال ایک اعلیٰ خلق ہے۔ غضب ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا صحیح استعمال ایک اعلیٰ خلق ہے۔ غیرت ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا صحیح استعمال ایک اعلیٰ خلق ہے۔ اور اسی طرح اور بہت سے فطری جذبات ہیں جن کا صحیح استعمال ایک اعلیٰ خلق ہے۔ اور یہ سب جذبات فطرتِ انسانی کے اندر خالقِ فطرت کی طرف سے اپنے ظل ہونے کی حیثیت سے ودیعت کئے گئے ہیں۔ اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے یہ سب جذبات اپنی ذات میں نہ اچھے ہیں اور نہ بُرے بلکہ محض سادہ فطری جذبات ہیں اور صرف ان کا صحیح یا غلط استعمال انکو اچھا یا بُرا خلق بناتا ہے اور اس صحیح اور غلط استعمال کا معیار یہ ہے کہ انسان کے ان فطری جذبات کا اظہار خدائی صفات کے رنگ میں ہو جسکے علم کا ذریعہ خدا کا فعل یعنی نیچر اور خدا کا قول یعنی شریعت ہے۔ اور اس کے سوا علم الاخلاق کی پیچیدہ گتھیوں کا اور کوئی حل نہیں۔ اور یہ ایک عظیم الشان فائدہ ہے جو ایمان باللہ سے دُنیا کو حاصل ہو سکتا ہے +

اسی طرح اور بھی بہت سے فوائد ہیں لیکن اس جگہ صرف ان فوائد کے بیان پر ہی میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں مگر میں یہ بات پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں صرف ان فوائد کی بحث تھی جو عمومی طور پر ایمان باللہ کے عقیدہ سے دنیا کو حاصل ہو سکتے ہیں اور اُن عظیم الشان مخصوص فوائد کا ذکر نہیں جو ایک مومن باللہ قربِ الٰہی میں ترقی کر کے رُوحانی یا اخلاقی یا مادی طور پر حاصل کر سکتا ہے اور جو خدا کی مقرب جماعتوں کو حاصل ہؤا کرتے ہیں اور ان کا بیان انشاء اللہ اپنی جگہ پر کیا جائے گا اس جگہ میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ان عمومی فوائد کا ذکر اس غرض سے نہیں کیا کہ یہ خدا کی ہستی کی دلیل ہیں بلکہ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اگر خدا واقعی موجود نہیں ہے تو یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ خدا کے ماننے سے کوئی فایدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے اسے یونہی بلا دلیل مان لینا چاہیئے بلکہ یہ بحث صرف ضمنی طور پر اس جگہ داخل کی گئی ہے تاکہ یہ ثابت ہو کہ نہ

صرف یہ کہ ہمارا ایک خالق و مالک واقعی موجود ہے بلکہ اس پر ایمان لانا دنیا کے لئے نفع بخش بھی ہے ✢

دہریت کے دلائل کی تردید

اب میں نہایت مختصر طور پر بعض ان دلائل کی تردید کرنی چاہتا ہوں جو دہریوں کیطرف سے اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی باتوں کا جواب تو اوپر کے مضمون کے اندر آگیا ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں میں نے ہستی باریتعالیٰ کی کوئی دلیل پیش کی ہے وہاں ساتھ ہی اس دلیل کے متعلق معترضین کے عام اعتراضات کا جواب بھی تحریر کر دیا ہے لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جو کسی اثباتی دلیل کی ضمن میں نہیں آسکتی تھیں اور اس لئے وہ اوپر کی بحث میں نہیں آئیں۔ لہٰذا اس جگہ صرف ان موخر الذکر باتوں کے متعلق بحث کی جاوے گی۔ اور باقی باتوں کے متعلق صرف ایک مختصراً اشارہ کر دیا جائے گا تاکہ مضمون کی تدوین مکمل رہے ✢

تین قسم کی دہریت

سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ دنیا میں دہریہ خیال کے لوگ تین قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اوّل وہ دہریہ جو صرف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا موجود ہونا ثابت نہیں ہے یعنی چونکہ ہمارے پاس خدا کے موجود ہونے کی کوئی صحیح اور مضبوط دلیل نہیں ہے اس لئے ہم اسے نہیں مانتے۔ اور انہی لوگوں کی کثرت ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دہریوں میں اس خیال کے لوگ شائد نوّے فیصدی سے بھی زیادہ ہونگے دوسرے وہ دہریہ ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہستی باریتعالیٰ کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جو دلائل کے ساتھ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا کے موجود ہوتے یا نہ ہونے کے سوال کو دلائل کے ساتھ حل کیا جا سکے اور ایسے لوگ بھی عملاً خدا کو نہیں مانتے۔ تیسرے وہ دہریہ ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی خدا موجود نہیں ہے یعنی وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کا موجود نہ ہونا بعض دلائل و قرائن سے ثابت ہے مگر ایسے لوگ بھی اپنے عقیدہ کی حقیقی بنیاد ان دلائل پر نہیں رکھتے۔ بلکہ انکی حقیقی بنیاد بھی دراصل اسی بات پر ہوتی ہے کہ خدا کے موجود

ہونے کا کوئی ثبوت نہیں لیکن ضمنی طور پر وہ بعض دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر یہ لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ اور غالباً دہریوں میں انکی تعداد ایک فیصدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ گویا پہلی قسم کے دہریوں کے عقیدہ کا خلاصہ "عدم تسلیم بوجہ عدم ثبوت" ہے۔ دوسری قسم کے دہریوں کے عقیدہ کا خلاصہ "عدم تسلیم وانکار بوجہ عدم امکان ثبوت و انکار" ہے۔ اور تیسری قسم کے دہریوں کے عقیدہ کا خلاصہ "انکار بوجہ وجوہ انکار" ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دہریوں میں پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور تیسری قسم کے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور درمیانی قسم کے لوگوں کی تعداد بھی کم ہے مگر تیسری قسم سے زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یورپ و امریکہ کے دہریوں نے جو نام اپنے لئے پسند کیا ہے وہ agnostic ہے جسکے معنی نہ جاننے والے کے ہیں یعنی انہوں نے اپنی پوزیشن صرف یہ رکھی ہے کہ ہمارے پاس خدا کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور مثبت انکار کی پوزیشن کو ان لوگوں نے اختیار نہیں کیا۔ الغرض دہریوں میں بہت زیادہ کثرت انہی لوگوں کی ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ چونکہ خدا کے موجود ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اس لئے ہم اسپر ایمان نہیں لاتے اور بس۔ مگر اس جگہ ہمیں ان لوگوں کے عقائد کی تردید مقصود نہیں۔ کیونکہ انکے خیالات کی تردید میں تو درحقیقت یہ سارا مضمون ہی بھرا پڑا ہے اور ہر اثباتی دلیل کی ضمن میں ایسے لوگوں کے شبہات کا بھی ازالہ کیا جاتا رہا ہے۔ اور دوسرے اثباتی دلائل جو اگلے حصہ مضمون کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں وہ انشاء اللہ اپنے وقت اور موقع پر آگے چلکر بیان کئے جاوینگے۔ اسی طرح دوسری قسم کے دہریوں کے عقائد کی تردید بھی اوپر کی بحث میں خود بخود آگئی ہے۔ اور باقی انشاء اللہ آگے آئیگی بس اس جگہ میرا مقصد صرف تیسری قسم کے لوگوں کے خیالات کی تردید ہے جو یہ دعوے کرتے ہیں کہ بعض دلائل اور قرائن سے خدا کا نہ ہونا ثابت ہے اور ان لوگوں کے عقائد کی تردید میں بھی میں اس جگہ صرف ان باتوں کو بیان کرونگا جو گزشتہ مضمون میں کسی جگہ بیان نہیں ہوئیں۔ کیونکہ بعض جگہ اوپر کے مضمون میں ان لوگوں کے عقائد کی تردید بھی ضمناً بیان کیجا چکی ہے اور اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف اشارہ کافی ہوگا۔ سو جاننا چاہیئے کہ یہ دہریہ لوگ اپنے خیال کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:-

دہریت کی پہلی دلیل اور اُس کا ردّ

پہلی دلیل جو یہ دہریہ اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کرتے ہیں یہ ہے کہ اس کائنات کے متعلق امکاناً دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے کسی بالا ہستی نے پیدا کیا ہے دوسرے یہ کہ وہ خود بخود اپنے کسی اندرونی قانون اور سلسلہ اسباب و علل کے ماتحت ہمیشہ سے یا کسی خاص زمانہ سے چلتی چلی آرہی ہے ان دو صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت عقل انسانی تجویز نہیں کرتی۔ اور گو یہ دونوں صورتیں عقل انسانی کے ادراک سے بالا ہیں یعنی ہماری عقل اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک چیز (خواہ وہ خدا ہو یا کائنات) خود بخود ہمیشہ سے یا کسی خاص زمانہ سے چلتی چلی آرہی ہے لیکن ہم مجبور ہیں کہ انہی دو صورتوں میں سے کسی صورت کو قبول کریں کیونکہ اسکے بغیر کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے اور جب ہم نے انہی میں سے کسی ایک کو قبول کرنا ہے تو دُنیا کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ وہ اپنے اندرونی سلسلہ اسباب و علل کے ماتحت خود بخود چلتی چلی آرہی ہے زیادہ آسان اور زیادہ سادہ اور زیادہ محفوظ ہے بہ نسبت اسکے کہ اس کائنات کے اوپر کسی بالا ہستی کو مانکر پھر اسکے متعلق یہی صورت تسلیم کیجاوے کہ وہ خود بخود ہمیشہ سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس دلیل کا مفصل ردّ اوپر گذر چکا ہے جہاں کائناتِ عالم کی بنا پر ہستی باریتعالیٰ کے متعلق اثباتی دلیل بیان کی گئی ہے اور اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ وہاں پوری تشریح کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا تھا کہ یہ کارخانہ عالم اور ذات باریتعالیٰ اپنے حالات و صفات کے اختلاف کی وجہ سے ایک حکم میں نہیں آسکتے اور نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ دونوں کو ہمیشہ سے خود بخود ماننا ایک ہی رنگ رکھتا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جہاں خدا اپنے صفاتِ اُلوہیت کی وجہ سے اس بات کو چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہو اور اس کے اوپر کوئی بالا ہستی نہ ہو وہاں یہ دنیا و مافیہا اپنے حالات سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ خود بخود ہمیشہ سے نہیں ہیں۔ اور نہ اس بات میں کوئی امر مانع ہے کہ انکے اوپر کوئی اور بالا ہستی موجود ہو پس فرق ظاہر ہے اور اس لئے دونوں کو ایک قیاس کے ماتحت ہر گز نہیں لایا جا سکتا۔ اور یہ بالکل غلط ہے کہ دُنیا کو ہمیشہ سے ماننا نسبتاً زیادہ آسان اور سادہ اور محفوظ ہے بلکہ دُنیا کو ہمیشہ سے ماننے میں اس قدر اشکال پیش آتے ہیں کہ جن کا

کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ دنیا کو مخلوق مانکر اسکے خالق کو ہمیشہ سے ماننا یقیناً زیادہ قریب الفہم اور زیادہ قرینِ قیاس اور زیادہ سادہ اور زیادہ محفوظ ہے اور پھر خدا کے موجود ہونے کے دلائل مزید برآں ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو ناظرین اس بحث کو دوبارہ دیکھ سکتے ہیں جو اس امر کے متعلق اوپر گذر چکی ہے اس جگہ اعادہ کی ضرورت نہیں ÷

دوسری دلیل اور اس کا ردّ

دوسری دلیل ہستی باری تعالیٰ کے انکار کی ان دہریوں کیطرف سے یہ پیش کیجاتی ہے کہ قانونِ نیچر اور سلسلہ اسباب و علل اس قدر کامل و مکمّل ہے کہ اسکے ہوتے ہوئے اس کائنات کے لئے قطعاً کسی خدا یا بالا ہستی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور بغیر کسی ضرورت کے کسی بالا ہستی کو ماننا ایک وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس دلیل کا ردّ بھی اوپر گذر چکا ہے جہاں یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح باوجود ایک مکمّل قانون کے ایک بالا ہستی کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نیز یہ بھی بتایا گیا تھا کہ باوجود اس سلسلہ اسباب و علل کے اس دُنیا میں ایک خاص غرض و غایت اور ایک خاص منشاء حیات کا پایا جانا ایک صانع و متصرف ہستی پر دلالت کر رہا ہے ضرورت ہو تو اس بحث کو بھی اوپر دیکھا جا سکتا ہے۔ اعادہ کر کے مضمون کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ دراصل یہ نہیں سوچا گیا کہ گو اسباب و علل اپنی ذات میں بھی ایک صانع اور نگران ہستی کو چاہتے ہیں لیکن اگر ایسا نہ بھی سمجھا جاوے تو پھر بھی وہ اوزار کی حیثیت تو بہر حال ضرور رکھتے ہیں جن سے ایک کاریگر آگے ایک چیز تیار کرتا ہے۔ جو ان اوزار کے استعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور کاریگر کا وجود زیادہ تر اس نتیجہ سے ظاہر ہوا کرتا ہے پس یہ اسباب و علل خدا کی ہستی کے خلاف ہرگز بطور دلیل کے پیش نہیں کئے جا سکتے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ان اسباب کا وجود اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان اسباب کا نتیجہ جو اس کائنات کے ایک خاص سمت میں اور ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت چلنے سے ظاہر ہو رہا ہے ایک بالا ہستی کے موجود ہونے کا بیّن ثبوت ہے جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا ÷

تیسری دلیل اور اس کا ردّ

تیسری دلیل جو بعض دہریوں کیطرف سے پیش کی جاتی ہے اور جس سے وہ خدا کی ہستی کے خلاف

استدلال کرتے ہیں وہ مسئلہ ارتقا پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈارون کی پیش کردہ تھیوری نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ جو چیزیں اسوقت دنیا میں نظر آتی ہیں انکی موجودہ شکل و صورت ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی کہ جو اب ہے بلکہ ابتدا میں وہ ایک ادنیٰ حالت میں تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ارتقا کر کے اپنی موجودہ شکل وصورت کو پہنچی ہیں۔ یعنی ہر چیز آہستہ آہستہ اپنے ماحول کے مناسب حال صورت اختیار کرتی گئی ہے اور جو چیزیں اس ماحول کے مطابق تغیر پذیر نہیں ہو سکیں وہ آہستہ آہستہ ضائع ہو گئیں۔ اور اس سے یہ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ عالم میں کوئی ترتیب یعنی Plan یا Design نہیں ہے بلکہ موجودہ کائنات محض اتفاقی حالات کا نتیجہ ہے۔ اس دلیل کا اصولی رد بھی اوپر گذر چکا ہے اور علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ماحول کے مناسب حال نہ ہونیکی وجہ سے بعض چیزوں کا ضائع ہو جانا اور بعض کا اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ماحول کے مطابق بنا لینا ہرگز اسبات کو ثابت نہیں کرتا کہ دنیا بغیر کسی Plan یا Design کے ہے بلکہ اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو یہی بات کہ بعض چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں اور بعض قایم رہتی ہیں عالم میں ایک Design یعنی ایک ترتیب اور ایک علت غائی اور ایک منشار حیات کو ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ بعض چیزوں کا گر جانا اور بعض کا قایم رہنا سراسر حکمت کے فعل کا نتیجہ ہے اور اسبات کو ظاہر کرتا ہے کہ خالق کائنات اپنے باغ کی بہبودی و ترقی کے خیال سے درختوں کی کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے اور جو شاخیں یا پودہ جات کمزور ہوتے ہیں اور کسی نقص کی وجہ سے تغیرات زمانہ کے اثرات کو برداشت نہیں کر سکتے اور اپنی پیدایش کی غرض کو پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں انہیں کاٹ کر گرا تا جاتا ہے۔ تاکہ دوسرے مناسب حال پودے جو ترقی کی طاقت رکھتے ہیں زیادہ آزادی کے ساتھ نشوونما پائیں اور ان کمزور شاخوں یا پودوں کا وجود انکی ترقی میں روک نہ ہو۔ اور اگر یہ کہا جاوے کہ جب خدا کو یہ علم تھا کہ جہان کائنات کی فلاں فلاں شاخ یا پودہ کمزور رہے گا۔ اور اپنی پیدایش کی غرض کو پورا نہیں کر سکے گا تو اس نے اسے پیدا ہی کیوں کیا تو اس کا یہ جواب ہے کہ خدا نے تو تمام چیزوں کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کیا ہے اور اس کا یہی منشار ہے کہ وہ اس غرض و غایت کو پورا کریں

لیکن اگر کوئی چیز عام قانونِ نیچر کے ماتحت اپنے اندر کوئی نقص پیدا کر لیتی ہے اور زندگی کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی اور اپنی خلقت کی غرض کو پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے تو قانونِ نیچر کے ماتحت ہی وہ گر جاتی ہے۔ گویا کہ دونوں قانون خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کرتا ہے اور اس کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ اس غرض و غایت کو پورا کرے۔ اور یہ بھی کہ جو چیز ضرر رساں اثرات کے ماتحت آ کر اس غرض و غایت کے پورا کرنے سے قاصر رہے وہ ضائع ہو جاوے۔ جس طرح مثلاً ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے روحانی اور مادی ترقی کے لئے پیدا کیا ہے لیکن بعض انسان اپنے اعمال کی وجہ سے اس غرض کو پورا نہیں کرتے اور پھر وہ بوسیدہ شاخوں کی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ بعض صورتوں میں قانونِ نیچر کے ماتحت انکی پیدائش کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک عرصہ تک قائم رہ کر دوسری چیزوں کی ترقی میں امداد دیں اور پھر جب یہ دوسری قائم رہنے والی چیزیں مستحکم ہو جائیں اور اپنے اس کمال کو پہنچ جائیں جو انکی خلقت کا مقصد ہے تو ان سہارا دینے والی چیزوں کو ضائع کر دیا جاوے جیسا کہ زراعت میں بھی بعض اوقات بعض پودہ جات لگائے جاتے ہیں اور بعض دوسرے پودہ جات جن کا وجود بالذات مقصود نہیں ہوتا۔ ان پودہ جات کی حفاظت اور پرورش اور ترقی کے لئے انکے آس پاس لگا دیئے جاتے ہیں اور پھر جب اصل پودہ جات اچھی طرح مستحکم ہو جاتے ہیں تو یہ پودے ضائع کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ اب انکی پیدائش کی غرض پوری ہو چکی ہوتی ہے اور اسکے بعد ان کا قائم رہنا ان پودہ جات کے لئے جو بالذات مقصود ہیں ضرر رساں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سائنس سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ بعض چیزوں کا مرنا ہی اپنی ذات میں دوسری چیزوں کی زندگی اور استحکام اور ترقی کا موجب ہوتا ہے اور اس لئے انکی پیدائش کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود مر کر دوسروں کی زندگی اور ترقی کا باعث بنیں۔ اور اسکی بیشمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ الغرض کسی طرح بھی دیکھا جاوے بعض چیزوں کا ایک وقت تک چل کر ضائع ہو جانا اور بعض کا قائم رہنا اور ترقی کر جانا ہرگز خدا کی ہستی کے خلاف بطور دلیل کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے

کہ اس دُنیا کے اوپر ایک مدرک بالارادہ حکیم وعلیم ہستی موجود ہے جو ایسے حکیمانہ طور پر ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت دُنیا کے کارخانہ کو چلا رہی ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ جو چیزیں ضائع ہوتی ہیں وہ محض اس قانون کے نتیجے میں ضائع ہوتی ہیں۔ کہ کمزور چیز گر جاتی ہے اور مضبوط باقی رہتی ہے اور اس میں کسی بالا ہستی کا ہاتھ تلاش کرنا ایک وہم سے بڑھ کر نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ہرگز قانون کے منکر نہیں ہیں بلکہ ہم تو خود اس سلسلہ اسباب وعلل کے قائل اور اسکے پیش کرنیوالے ہیں مگر اس قانون اور سلسلہ اسباب وعلل سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی کہ اسکے اوپر کوئی خدا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر مفصل بیان کیا جاچکا ہے خود اس سلسلہ اسباب وعلل کا وجود ایک بالا ہستی کیطرف اشارہ کر رہا ہے اور ان اسباب کا مجموعی نتیجہ ایک زاید روشن دلیل ہے کما مرّ۔ اس جگہ میں پھر دوبارہ یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسئلہ ارتقا جس صورت میں کہ ڈارون وغیرہ نے اسے پیش کیا۔ ہرگز سائنس کی کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے بلکہ صرف ایک تھیوری ہے جسکی بعض تفصیلات سے بعض دوسرے سائنس دان اتفاق نہیں کرتے ؛

چوتھی دلیل اور اس کا ردّ

چوتھی دلیل جو دہریوں کی طرف سے ہستی باری تعالیٰ کے خلاف پیش کیجاتی ہے وہ بھی مسئلہ ارتقا پر مبنی ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ خلق عالم اور خلق آدم کے متعلق جو تعلیم مذاہب نے پیش کی ہے وہ سب مسئلہ ارتقا کی روشنی میں سراسر غلط اور باطل ثابت ہوگئی ہے اور اس لئے یہ معلوم ہوا کہ مذاہب کی تعلیم جھوٹی اور خلاف واقعہ ہے اور جب مذاہب باطل ہوگئے تو خدا کا عقیدہ بھی جو انسان کو مذہب سے حاصل ہوا ہے خود بخود باطل اور غلط ثابت ہوگیا۔ اس دلیل کے متعلق بھی اوپر کے مضمون میں مفصل بحث گذر چکی ہے اور اس اعتراض کا کافی وشافی جواب دیا جاچکا ہے اور اب اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں (دیکھو ص ۵۸ تا ۶۴)

پانچویں دلیل اور اس کا ردّ

پانچویں دلیل جو دہریوں کیطرف سے پیش کیجاتی ہے یہ ہے کہ جس قانون نیچر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بالا ہستی کا پیدا کردہ ہے وہ بعض صورتوں اور بعض حالات میں ایسا ظالمانہ ہے اور اس طرح اندھا دھند طریق پر چلتا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطالعہ کرکے اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ یہ کسی صاحب شعور ہستی کا پیدا کردہ ہے بلکہ اسکے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یونہی کسی اندرونی تغییر یا سلسلہ اسباب وعلل

کے نتیجہ میں یہ سب کچھ چل رہا ہے مثلاً بعض اوقات حادثات کا پیش آنا۔ اور اس کے نتیجے میں بے گناہ لوگوں کا نقصان اُٹھانا۔ یا مارا جانا۔ وباؤں اور بیماریوں کا پھیلنا مصائب و آلام کا پیش آنا۔ کسی شخص یا چیز کا شاہراہ ترقی پر چلتے چلتے تباہی و بربادی کیطرف مائل ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں جو روز دنیا میں ہوتی رہتی ہیں۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ دُنیا کے اوپر کوئی خدا وغیرہ نہیں ہے ورنہ یہ اندھیر نگری اور یہ مصائب و آلام ہرگز نہ ہوتے۔ یہ اعتراض ایک ایسا اعتراض ہے جس کا جواب اوپر کے مضمون میں نہیں آیا لہٰذا ضروری ہے کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا جواب لکھا جاوے۔ سو جاننا چاہیئے کہ یہ اعتراض صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترضین نے ان دو مختلف قسم کے قوانین پر پوری طرح غور نہیں کیا جو خدا کیطرف سے اس دنیا میں جاری ہیں۔ اور یہی سمجھ رکھا ہے کہ دنیا کا سارا کاروبار ایک ہی قانون کے ماتحت چل رہا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور حق یہ ہے کہ خدا کیطرف سے دُنیا میں دو مختلف قانون جاری ہیں۔ ایک قانون نیچر ہے جو نظام عالم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور سلسلہ اسباب و علل اور خاصیات اشیا کے ماتحت جاری ہے اور جسکے اثرات و نتائج اسی دُنیا میں ساتھ ساتھ رونما ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرا قانون شریعت ہے جو انسان کے اخلاق و روحانیات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور انبیاء و مرسلین کے ذریعہ دُنیا میں نازل ہوتا رہا ہے اور جسکی جزا و سزا کے لئے بعد الموت کا وقت مقرر ہے اور مندرجہ بالا اعتراض ان دو قانونوں کے مخلوط کر دینے اور ان کے صحیح امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ قانونِ نیچر کیا ہے؟ قانونِ نیچر یہ ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اور ہر بات اور ہر حرکت اور ہر سکون اور ہر مفرد اور ہر مرکب میں ایک معین فطری تاثیر ہے جو اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً یہ بات قانون نیچر کا حصہ ہے کہ آرسنک میں جاندار چیز کے مار دینے کی خاصیت ہے اور جب بھی اور جہاں بھی آرسنک کسی جاندار چیز کے اندر اس مقدار میں جائیگی جو اسے مار دینے کے لئے کافی ہے تو اس کا طبعی نتیجہ رونما ہوگا۔ سوائے اس کے کہ قوانین نیچر کا ہی کوئی دوسرا قانون جو اس اثر کے مٹانے کے لئے مقرر ہے دخل انداز ہو کر اسکے اثر کو مٹا دے

اسی طرح یہ بات قانونِ نیچر کا حصہ ہے کہ اگر کوئی چھت کمزور اور بودی ہوگی تو کسی ایسے وقت جب کہ اسکی کمزوری اس حد کو پہنچ جاوے کہ وہ قائم نہ رہ سکے وہ گر جاویگی اور یہ بات بھی اسی قانونِ نیچر کا حصہ ہے کہ گرنے والی چھت کے نیچے اگر کوئی شخص آئے گا تو وہ مر جائے گا۔ پس جو شخص بھی اس قانون کی زد میں آئے گا وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ سوائے اسکے کہ اس قانون کے اثر کو مٹا دینے والا کوئی اور قانون درمیان میں دخل انداز ہو جاوے۔ اسی طرح یہ بات قانونِ نیچر کا حصہ ہے کہ جو شخص غرقاب پانی کے اندر جاتا ہے اور وہ تیرنا نہیں جانتا وہ ڈوب جائے گا۔ پس جو شخص بھی تیرنا نہ جاننے والا ایسے پانی میں داخل ہوگا وہ موت سے بچ نہیں سکے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی اور قانون جو اس قانون کے اثر کو مٹا دینے کی خاصیت رکھتا ہو اسے بچا لے۔ اسی طرح یہ بات قانونِ نیچر کا حصہ ہے کہ خواہ کوئی چیز کتنی ہی ترقی یافتہ ہو اسکے رستے میں جب کوئی ضرر رساں اور نقصان دہ چیزیں حائل ہونگی اور اس کو انکے مقابلہ کی طاقت نہیں ہوگی تو اس کی ترقی رُک کر تنزل و انحطاط کی صورت پیدا ہو جائیگی سوائے اس کے کہ قانونِ نیچر ہی کے ماتحت ان موانع کے اثر کو مٹا دینے والے ذرائع میسر آجائیں۔ یہ سب باتیں اور اسی قسم کی لاتعداد دوسری باتیں قانونِ نیچر کا حصہ ہیں۔ اور اس قانون کے ماتحت ہر چیز اپنے طبعی اثرات پیدا کر رہی ہے۔ اور اس عظیم الشان مشین کے پہیے ہر وقت حرکت میں ہیں اور انکے لئے نپنے اور بگڑنے کا کوئی سوال نہیں ہے بلکہ عام حالات میں (یعنی مستثنیات کو الگ رکھ کر جنکے لئے ایک الگ مستقل اصول ہے) جو بھی ان کے سامنے آجاوے اسے وہ اپنے مقررہ فرائض کے ماتحت اوپر کیطرف اٹھانے یا نیچے کی طرف گرانے آگے کی طرف بڑھانے یا پیچھے کیطرف ہٹانے میں مجبور ہیں۔ برخلاف اسکے قانونِ شریعت کیا ہے؟ قانونِ شریعت وہ قانون اور ضابطہ عمل ہے جو کوئی مذہب اپنے متبعین کے سامنے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے تاکہ وہ اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے اخلاق کو درست کریں۔ اور خدا کا قرب حاصل کرکے ان فیوض و برکات سے حصہ پاویں جو خدا کے پاک بندوں کے لئے مقدر ہیں مگر اس قانون کے ماتحت ہر شخص کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اس قانون کی پابندی اختیار کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ اور اس کی جزا سزا کے لئے موت کے بعد کا وقت مقرر ہے

(سوائے بعض خاص خاص نیم مخفی اثرات کے جو اسی دُنیا میں رونما ہو جاتے ہیں) مثلاً قانونِ شریعت انسان کو کہتا ہے کہ خدا کا قرب اور اسکی رضا حاصل کرنے کے لئے تجھے چاہیئے کہ اپنے خدا کی اس اس طرح عبادت کرے مگر وہ انسان کو اس عبادت پر مجبور نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف چلنا چاہے تو وہ خلاف ورزی کر سکتا ہے اور کوئی چیز اس کا ہاتھ نہیں روکتی۔ اور گو اس خلاف ورزی کا اثر باریک طور پر اسی دُنیا میں ظاہر ہو جاوے مگر اسکی اصل اور معین سزا اگلے جہان میں ہی ملتی ہے اور اسی لئے مذہبی لوگوں میں یہ ایک عام مقولہ ہے کہ دنیا دار العمل ہے۔ اور اگلا جہان دار الجزاء۔ مگر قانون نیچر کی یہ حالت نہیں بلکہ اسکے لئے یہی دُنیا دار العمل ہے اور یہی دار الجزاء اور یہ دونوں قانون سوائے استثنائی حالات کے جنکے بیان کی اس جگہ ضرورت نہیں ہے کبھی ایک دوسرے کے دائرہ عمل میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ اگر کوئی شخص نیچر کے کسی قانون کی زد میں آجاوے تو پھر وہ اسکے اثر سے صرف اس وجہ سے محفوظ رہے کہ وہ قانونِ شریعت کے لحاظ سے مجرم نہیں ہے بلکہ عام حالات میں وہ یقیناً قانونِ نیچر کی زد میں آنے کا نتیجہ بھگتے گا۔ اور قانونِ شریعت کی پابندی اُسے اس نقصان اور تکلیف سے نہیں بچا سکے گی۔ مثلاً اگر ایک چھت بوجہ کمزوری کے گرنے والی ہو اور اس کے نیچے دو شخص بیٹھے ہوں جن میں سے ایک قانون مذہب کے لحاظ سے بہت اچھا آدمی ہو۔ اور دوسرا بدکردار اور عاصی۔ تو عام حالات میں ایسا نہیں ہوگا کہ چھت کے گرنے کے وقت اچھا آدمی بچ جاوے اور بدکردار مر جاوے بلکہ اگر چھت ایسے طور پر گرے گی کہ اسکے نیچے آنے والے بچ نہ سکیں تو دونوں مرینگے۔ اور اگر قانون نیچر کے ماتحت بچنے کی کوئی صورت ہوگی تو دونوں بچ جائینگے۔ اسی طرح اگر کوئی نیک اور متقی آدمی غرقاب پانی میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ تیرنا نہیں جانتا۔ تو اسکی نیکی اسے ڈوبنے سے نہیں بچا سکیگی کیونکہ اسکی نیکی قانون شریعت کے دائرہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر یہاں قانون نیچر کا دائرہ عمل ہے جسمیں عام حالات میں قانونِ شریعت کی کوئی پاسداری نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ قاعدہ یہی ہے کہ قانون شریعت کے دائرہ کی نیکی یا بدی صرف شرعی جزا سزا میں اثر رکھتی ہے اور

قانون نیچر کی جزا سزا کے وقت اس کا کوئی وزن نہیں اور اسی طرح قانون نیچر کی اطاعت یا نافرمانی صرف نیچر کے جزا سزا میں اثر رکھتی ہے اور قانون شریعت کی جزا سزا کے وقت اس کا کوئی وزن نہیں۔ پس ایک دہریہ کا اپنے عقیدہ کی تائید میں یہ کہنا بالکل فضول اور باطل ہے کہ مثلاً چونکہ فلاں شخص جو بڑا نیک اور شریف آدمی تھا۔ اور اسکے چھوٹے چھوٹے بچے تھے وہ دریا پر نہانے گیا اور اچانک ڈوب کر مر گیا۔ حالانکہ اسی وقت ایک آوارہ مزاج آدمی بھی دریا پر نہا رہا تھا مگر وہ صحیح سلامت گھر واپس آگیا۔ یا فلاں لڑکی جو نہایت پاکباز اور خوش اخلاق تھی وہ اپنی شادی کے دوسرے دن آگ لگ جانے سے ہلاک ہوگئی حالانکہ ایک دوسری لڑکی جو سخت بد خلق اور بد چلن تھی اور اسکی شادی بھی اسی دن ہوئی تھی مزے سے زندگی گذار رہی ہے۔ یا فلاں بچہ جو نہایت بھولا بھالا اور نیک سیرت تھا چھت کے نیچے دب جانے سے مر گیا۔ حالانکہ اسی وقت اس کے قریب ایک شریر اور گندہ لڑکا بھی کھیل رہا تھا جو چھت کے گرنے سے تھوڑی دیر پہلے کمرہ سے نکل گیا تھا اور اس پر کوئی مصیبت نہیں آئی۔ اس لئے ثابت ہوا کہ ہمارے اوپر کوئی خدا نہیں ہے۔ ورنہ یہ اندھیر نگری اور یہ ظلم نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ تو خوب سوچ لو کہ یہ اعتراض بالکل بودہ اور کمزور ہے کیونکہ جو شخص ڈوب گیا وہ گو قانون مذہب کا پابند تھا مگر قانون نیچر کا وہ مجرم بھی تھا اور اس لئے اس نے نیچر کے قانون کے ماتحت سزا پائی۔ اور دوسرا آدمی باوجود قانون مذہب کا مجرم ہونے کے قانون نیچر کی سزا سے بچ گیا۔ کیونکہ اس نے قانون نیچر کا کوئی جرم نہیں کیا تھا اسی طرح جو لڑکی جل کر مر گئی وہ قانون نیچر کی زد میں آگئی تھی اس لئے وہ ہلاک ہوگئی۔ اور چونکہ یہ جزا سزا قانون نیچر کی تھی۔ اس لئے قانون شریعت کا پابند ہونا اسے بچا نہیں سکا۔ مگر دوسری لڑکی باوجود قانون شریعت کی مجرم ہونے کے قانون نیچر کی سزا سے بچی رہی۔ کیونکہ اس نے قانون نیچر کا کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وعلیٰ ہذا القیاس پس یہ کوئی اندھیر نگری نہیں اور نہ کوئی ظلم و ستم ہے بلکہ یہ تو عین نیچر کی سیاست کا ایک طبعی نتیجہ ہے جو سب کے لئے برابر ہے۔ اندھیر تو تب ہوتا کہ نیچر کا کوئی قانون نہ ٹوٹتا اور پھر بھی نیچر سزا دیتی۔ یا یہ کہ قانون ٹوٹتا شریعت کا۔ مگر سزا نیچر دیتی۔ یا یہ کہ قانون ٹوٹتا نیچر کا اور سزا شریعت دیتی۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ جو ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ

نیچر کا قانون ٹوٹتا ہے تو نیچر سزا دیتی ہے اور شریعت کا قانون ٹوٹتا ہے تو شریعت سزا دیتی ہے (سوائے مستثنیات کے جنکی بحث ایک الگ مستقل مضمون ہے اور اس جگہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں) اور کوئی عقلمند اسبات کو موجب اعتراض یا خلاف انصاف نہیں سمجھ سکتا۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ معترضین کس عقل و دانش کے مالک بنکر اعتراض کیطرف قدم بڑھاتے ہیں اور اس کاروائی کو جو سراسر حکمت پر مبنی ہے اور جس میں کوئی قانون نہیں ٹوٹتا۔ اور نہ دو مختلف قانون آپس میں ٹکراتے ہیں انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ دراصل بدقسمتی سے سارا دھوکا یہ لگا ہے کہ واقعہ تو قانون نیچر کے ماتحت پیش آتا ہے اور اسکی وجہ قانونِ شریعت میں تلاش کی جاتی ہے اور وجہ کے نہ ملنے پر یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ بس سب اندھیر نگری ہے۔ اے بدقسمت لوگو خدا تمہیں عقل دے۔ نیچر کے واقعہ کی وجہ نیچر میں تلاش کرو۔ اور شریعت کی سزاؤں کی وجہ قانون شریعت میں۔ تب تمہیں معلوم ہوگا کہ اندھیر نگری وہ نہیں ہے جو ہو رہا ہے بلکہ وہ ہے جو تم کہتے ہو۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کیا اندھیر نگری ہوگی کہ اگر کوئی شخص قانونِ نیچر کی زد میں آجانے کی وجہ سے پانی میں ڈوب جاوے یا آگ میں جل جاوے یا چھت کے نیچے دب کر مر جاوے یا کسی اور طرح ہلاک ہو جاوے تو تم یہ خیال کرنے لگ جاتے ہو کہ چونکہ اس نے قانونِ شریعت کے ماتحت کوئی گناہ نہیں کیا تھا اس لئے اسکے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ افسوس افسوس ظالم تو تم ہو کہ قانون نیچر کا حق قانونِ شریعت کو دیتے ہو۔ اور قانون شریعت کا قانون نیچر کو۔ اور پھر اعتراض کرتے ہو خدا پر۔

خوب یاد رکھو کہ نیچر اور شریعت دو الگ الگ حکومتیں ہیں اور یہ حکومتیں مہذب سلطنتوں کی طرح ایک دوسرے کے انتظام میں دخل نہیں دیتیں سوائے اس کے کہ خدا کی مرکزی حکومت کسی اشد ضرورت کے وقت ایک ملک کی فوج کو دوسرے ملک کی امداد کے لئے جانے کا حکم دے جیسا کہ انبیاء و مرسلین کی بعثت کے وقت جبکہ دنیا کی اصلاح کے لئے آسمان پر ایک خاص جوش ہوتا ہے بعض صورتوں میں قانونِ نیچر کی طاقتوں کو شریعت کی خدمت میں لگا دیا جاتا ہے چنانچہ معجزات و خوارق اسی استثنائی قانون کی قدرت نمائی کا کرشمہ ہوتے ہیں مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ قانونِ نیچر اور قانونِ شریعت بالکل الگ الگ رہتے ہیں اور ایک دوسرے

کے دائرہ میں دخل نہیں دیتے اور نہ ایک دوسرے کی خاطر اپنا رستہ چھوڑتے ہیں۔ الغرض یہ سارا دھوکا ان دونوں قانونوں کے مخلوط کر دینے اور ان کے امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے ورنہ بات معمولی تھی +

تناسخ کا عقیدہ کس طرح پیدا ہوا ہے

اس جگہ یہ ذکر بھی خالی از فایدہ نہ ہوگا کہ تناسخ کا عقیدہ بھی اسی غلطی پر مبنی ہے۔ کیونکہ تناسخ کے ماننے والے بھی یہی دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ جو بچے دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ مختلف حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں یعنی کوئی بچہ تندرست پیدا ہوتا ہے تو کوئی کمزور و نحیف۔ کوئی آنکھوں والا پیدا ہوتا ہے۔ تو کوئی نابینا۔ کوئی ہاتھ پاؤں والا پیدا ہوتا ہے تو کوئی لولا لنگڑا۔ کوئی اچھے دماغ والا پیدا ہوتا ہے تو کوئی کند ذہن۔ پھر کوئی امیر کے گھر پیدا ہوتا ہے۔ تو کوئی غریب کے۔ وغیر ذالک۔ اس سے ثابت ہوا کہ موجودہ زندگی سے پہلے کوئی زندگی گذر چکی ہے جس کے اعمال کی پاداش میں بچوں کی حالت مختلف ہوگئی ہے وا لا اگر موجودہ زندگی سے پہلے کوئی زندگی نہیں گذری اور ان بچوں کے گذشتہ اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا ریکارڈ پہلے موجود نہیں ہے تو یہ اختلاف کیوں ہے کیا خدا ظالم ہے کہ اس نے ایک ہی نسل کے بچوں کو اس قدر مختلف صورتوں اور مختلف حالات کے ساتھ پیدا کیا ہے؟۔ اور اگر خدا ظالم نہیں ہے تو اس اختلاف کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس بات کو تسلیم کیا جاوے کہ ہماری موجودہ زندگی سے پہلے بھی کوئی زندگی گذر چکی ہے اور پیدائش کے وقت کا اختلاف اسی گذشتہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جو تناسخ والوں کی طرف سے پیش کیجاتی ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے بھی قانونِ شریعت اور قانونِ نیچر کے امتیاز کو بھلا کر ایک ہی قانون سے سارے واقعات کو ناپنا چاہا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ پیدائش کے وقت کا اختلاف قانونِ شریعت کے ماتحت نہیں ہے کہ اسکے لئے گذشتہ اعمال کا کوئی ریکارڈ تلاش کیا جاوے بلکہ وہ قانونِ نیچر کے ماتحت ہے یعنی والدین بلکہ والدین سے بھی اوپر کے اجداد کی جسمانی اور اقتصادی حالت سے بچہ حصہ پاتا ہے اور چونکہ مختلف بچوں کے والدین کے حالات مختلف ہوتے ہیں اس لئے بچوں کے

حالات بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ علم طب نے جو قانون نیچر کا حصہ ہے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اگر والدین تندرست ہونگے تو بچہ بھی تندرست ہوگا۔ اور اگر والدین کمزور ہونگے تو بچہ بھی کمزور ہوگا۔ حتیٰ کہ والدین کی جسمانی حالت کی تفصیلات میں بھی بچہ ان کا وارث ہوتا ہے یہ علم اس قدر وسیع ہے اور ایسے طور پر بار بار کے تجربات اور مشاہدات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ کوئی عقلمند اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ یہاں تک ثابت ہو چکا ہے کہ جس وقت مرد اور عورت اکٹھے ہوتے ہیں تو انکی اس وقت کی حالت بھی بچے پر ایک گہرا اثر پیدا کرتی ہے۔ اور اسی لئے شریعت اسلامی نے کمال حکمت سے اس بات کا حکم دیا ہے کہ جب مرد اور عورت اکٹھے ہونے لگیں تو انہیں چاہیئے کہ اپنے دل کے خیالات کو پاک وصاف بنا لیں تاکہ بچہ انکی اس ذہنی نیکی سے حصہ پاوے۔ الغرض یہ بات علم طب کی رُو سے قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ والدین بلکہ والدین سے بھی پہلے کا اثر بچہ میں پہنچتا ہے اور یہ جو دُنیا میں کوئی بچہ تندرست اور کوئی کمزور کوئی صحیح سلامت اور کوئی ناقص پیدا ہوتا ہے یہ سب اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ دراصل نیچر کا یہ ایک عام قانون ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے کے سہارے پر کھڑی ہوتی ہیں اور ہر چیز ہر دوسری چیز سے علیٰ قدرِ مراتب اثر لے رہی ہے اور اپنا اثر اسے دے رہی ہے اور اسی اثر کے ماتحت بچہ اپنے ماں باپ کی (جنسے وہ اقرب ترین تعلق رکھتا ہے) اچھی یا بُری حالت سے حصہ پاتا ہے۔ پس بعض لوگوں نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ بچوں کا پیدائش کے وقت کا اختلاف انکی کسی پہلی جون کے اعمال کی وجہ سے ہے بالکل غلط اور باطل ہے اور اس غلطی کی وجہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں نے قانون نیچر کے واقعات کی وجہ قانونِ شریعت میں تلاش کرنی چاہی ہے۔ الغرض دہریوں اور تناسخ کے ماننے والوں کا عقیدہ دراصل ایک ہی غلطی پر مبنی ہے یعنی دونوں نے قانونِ نیچر اور قانونِ شریعت کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا اور دونوں نے نیچر کے واقعہ کی وجہ قانون شریعت میں تلاش کرنی چاہی ہے اور چونکہ ان کو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ اس لئے ان میں ایک گروہ تو اس طرف مائل ہو گیا کہ یہ سب اندھیر نگری ہے اور خدا وغیرہ ایک خیال باطل ہے۔ اور دوسرا گروہ اس طرف مائل

ہوگیا کہ چونکہ خدا ظالم نہیں ہے کہ بلاوجہ کسی کو سزا دے۔ اس لئے بچوں کا پیدائش کے وقت کا اختلاف ضرور کسی پہلی جون کی وجہ سے ہوگا اور اس طرح انہوں نے تناسخ کا عقیدہ قائم کر لیا۔ حالانکہ اگر یہ دونوں گروہ ذرا غور اور تدبر سے کام لیتے تو بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے کہ خدا کیطرف سے دنیا میں دو مختلف قانون جاری ہیں اور ان دونوں کا دائرہ عمل بالکل الگ الگ ہے اور یہ ایک سخت غلطی ہے کہ قانون نیچر کے کسی واقعہ کی وجہ قانونِ شریعت میں تلاش کی جاوے۔ خلاصہ کلام یہ کہ دنیا میں جو حادثات پیش آتے ہیں یا بیماریاں پڑتی ہیں یا مصائب کا سامنا ہوتا ہے اور ان میں بعض اوقات نیک اور متقی لوگ بھی نقصان اُٹھاتے ہیں اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ قانون نیچر قانون شریعت سے الگ ہے۔ اور قانون شریعت کی نیکی قانون نیچر کی سزاؤں سے بچا نہیں سکتی جبتک کہ ان احتیاطوں کو کام میں نہ لایا جاوے جو قانون نیچر خود اس کے لئے پیش کرتا ہے۔ مثلاً پانی میں ڈوبنا ایک نیچر کا واقعہ ہے اور کسی شخص کی مذہبی نیکی اسے اسکے اثر سے بچا نہیں سکتی۔ جبتک کہ کوئی شخص تیرنا نہ سیکھے یا بعض دوسری احتیاطوں کو کام میں نہ لاوے جو پانی کی غرقابی سے بچنے کے لئے نیچر پیش کرتی ہے۔ اسی طرح کسی بچے کا کمزور پیدا ہونا ایک نیچر کا واقعہ ہے اور اس کے لئے کوئی شرعی وجہ تلاش کرنا فضول ہے بلکہ اس کے علاج کے لئے قانون نیچر ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور والدین کو اپنی بیماری کا علاج یا اپنی کمزوری کا ازالہ یا اپنے نقص کی تلافی کیطرف مائل ہونا چاہیئے +

اور اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ قانونِ نیچر کیوں قانونِ شریعت کا احترام نہیں کرتا یعنی ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب ایک شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو وہ حادثاتِ قضاء و قدر سے بھی محفوظ ہو جاوے تو اس کا پہلا جواب تو یہی ہے کہ ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ دونوں قانون مختلف ہیں اور دونوں کا الگ الگ کام ہے لیکن جو صورت معترض نے تجویز کی ہے اس سے دونوں قانون ایک ہو جاتے ہیں اور الگ الگ قانون کا وجود قائم نہیں رہتا۔ حالانکہ دو الگ الگ قانونوں کا پایا جانا اسبات کو ظاہر کرتا ہے

کہ دونوں قانونوں کا الگ الگ وجود بالذات مقصود ہے اور دوسرا اور حقیقی جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ دو قانون انسان کی دو مختلف قسم کی ترقیوں کے لئے جاری فرمائے ہیں یعنی قانون نیچر انسان کی مادی ترقی کے لئے بنایا گیا ہے۔ اور قانون شریعت اسکی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے۔ اور خدا کا منشا یہ ہے کہ انسان ہر جہت سے ترقی کرے۔ ایسی صورت میں اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص محض قانون شریعت کی پابندی اختیار کرنے کی وجہ سے قانون نیچر کا جرم کرتے ہوئے بھی اسکے بداثرات سے بچ جاوے تو یقیناً نتیجہ یہ ہو کہ انسان کی مادی ترقی کا دروازہ بالکل مسدود ہو جاوے۔ مثلاً اگر انسان کو اس کا نیک ہونا پانی کی غرقابی یا آگ کی سوزش یا بجلی کی تباہی سے بچالے تو انسان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ان چیزوں کے خواص کا مطالعہ کرکے انکی ماہیت کو سمجھنے اور ان کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کرے۔ خوب سوچ لو کہ انسان کی تمام مادی ترقی صرف اس اصل کی وجہ سے ممکن ہو رہی ہے کہ وہ جبتک قانون نیچر کا مطالعہ کرکے اپنے لئے آرام اور بہبودی اور ترقی کے دروازے نہیں کھولتا۔ اس کو آرام اور بہبودی اور ترقی میسر نہیں آتے۔ اور اسی لئے وہ ہر وقت نیچر کے مطالعہ اور خواص الاشیاء کی دریافت میں لگا رہتا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کسی ضرورت سے مجبور ہو جاتا ہے تو تبھی وہ نئی چیزوں کی ایجاد کی طرف توجہ کرتا ہے۔ پس اگر انسان کی مادی ضروریات محض قانون شریعت کی پابندی کی وجہ سے پوری ہو جایا کریں تو یقیناً نتیجہ یہ ہو کہ انسان کی مادی ترقی بالکل رُک جاوے اور دُنیاوی علوم کے تمام دروازے اس پر بند ہو جائیں کیونکہ اس صورت میں کوئی شخص مادی امور کی دریافت اور حقائق الاشیا کی تحقیق میں وقت اور توجہ صرف نہیں کر سکتا۔ پس ان دونوں قوانین کا ایک دوسرے کے کام میں دخل انداز نہ ہونا خدا کیطرف سے ایک عین رحمت کا فعل ہے اور یہ حادثات وغیرہ بھی اسی رحمت کا پیش خیمہ ہیں کیونکہ اگر دنیا میں کسی ایک فرد پر کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس حادثہ کے نتیجے میں جو بیداری اور اس قسم کے حادثات سے بچنے کا علاج دریافت

کرنیکی طرف جو توجہ پیدا ہوتی ہے وہ آیندہ کے لئے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو فایدہ پہنچا جاتی ہے اور ایک جان یا دس بیس جانوں کے ضائع جانے سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جانیں آیندہ پیش آنیوالے خطرات سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ الغرض یہ دونو قانون انسان کی الگ الگ قسم کی ترقی کے لئے مقصود ہیں۔ اور ان کا مخلوط ہو جانا یا ایک دوسرے کی خاطر اپنے رستے سے ہٹ جانا بجائے فائدہ مند ہونیکے یقیناً نہایت نقصان دہ اور نسل انسانی کی ترقی کے لئے از حد مہلک ہے اور حق یہی ہے کہ جو کچھ بھی اس وقت ان دو قانونوں کے ماتحت دنیا میں ہو رہا ہے وہ بنی نوع آدم کی مجموعی بہبودی اور ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے عین مناسب اور نہایت درجہ حکیمانہ ہے اور اس سے بہتر کوئی صورت ذہن میں نہیں آسکتی۔ اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو نیک اور متقی لوگ حادثات کے نتیجے میں یا کسی اور طرح قانون نیچر کی زد میں آکر بے وقت موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور انکے لواحقین کو بھی ان کی اس رنگ کی موت سے غیر معمولی صدمہ یا نقصان پہنچتا ہے انکے لئے اسلامی تعلیم سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ انکے واسطے اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے بعض دوسرے ذرائع رحمت کے پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اگر خدا ایک طرف دنیا کے لئے رحیم وکریم ہے اور اسکی بہبودی اور ترقی کے خیال سے اپنے قانون کا احترام کرواتا ہے اور عام حالات میں اس کو کسی فرد کی غیر متعلق نیکی کی وجہ سے توڑتا نہیں تو دوسری طرف وہ اپنے نیک بندوں کے لئے از حد مہربان بھی ہے اور اپنے تعلق میں سب وفاداروں سے بڑھ کر وفادار ہے اس لئے وہ ضرور ایسے موقع پر کسی اور ذریعہ سے ان کے نقصان کی تلافی کر دیتا ہے۔ مثلاً دنیاوی مصیبت کی وجہ سے آخرت میں انکو خاص انعام واکرام کا وارث بنا دیتا ہے یا انکے پسماندگان کو دُنیا کی برکات سے حصہ وافر دے دیتا ہے یا کوئی ایسا طریق اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے رحم و انصاف کے مطابق مناسب سمجھے اور جس سے کسی دوسرے کا حق بھی ضائع نہ ہو۔ اسی طرح جو بچے قانون نیچر کی وجہ سے کمزور اور ناقص پیدا ہوتے ہیں اور انکی یہ خلقی کمزوری یا نقص انکی رُوحانی ترقی میں روک ہو جاتا ہے تو اسکے متعلق بھی اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ شرعی جزا سزا کے وقت خدا تعالیٰ انکی اس

معذوری کو ضرور ملحوظ رکھتا ہے اور ان نقصوں کی وجہ سے جن کا ازالہ انکی طاقت سے باہر تھا ان پر مواخذہ نہیں کرتا۔ اور نہ ان کے اعمال کی جزا کو انکی کسی خلقی کمزوری کی وجہ سے کم ہونے دیتا ہے کیونکہ جیسا کہ خدا قرآن میں فرماتا ہے اس کا ترازو حق وانصاف کا ترازو ہے اور کوئی چیز جو کسی نہ کسی جہت سے ذرا بھی وزن رکھتی ہے اسکے تول سے باہر نہیں رہ سکتی ÷

دنیا میں گناہ کا وجود کیوں پایا جاتا ہے

اس جگہ ایک اور شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ دُنیا میں گناہ اور ظلم و تعدی کا وجود کیوں پایا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی خدا ہوتا تو لوگ ہرگز اس طرح گناہ و معاصم اور ظلم و ستم میں مبتلا نہ ہوتے۔ اور بدی کا وجود دنیا میں نہ پایا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معترضین نے قانونِ شریعت کی حقیقت اور غرض و غایت اور حکمت کو نہیں سمجھا۔ قانونِ شریعت اس اصل پر مبنی ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ایک ضابطہ عمل پیش کرکے انکو سمجھا دیتا ہے کہ تمہارے لئے اسپر کاربند ہونا ضروری ہے اور تمہاری اخلاقی اور رُوحانی ترقی اسکے بغیر ممکن نہیں لیکن اس سمجھا دینے کے بعد وہ لوگوں کو اختیار دے دیتا ہے کہ اب تم چاہو تو اس ضابطہ عمل کو اختیار کرو۔ اور چاہو تو اسے ردّ کردو۔ اور پھر جو اسے اختیار کرتا ہے اور جس حد تک اختیار کرتا وہ اس حد تک اسکے برکات اور نیک اثرات سے مستفیض ہوتا ہے اور اپنے خدا کا قرب حاصل کرتا ہے اور جو اسے اختیار نہیں کرتا وہ ان سب باتوں سے محروم رہتا ہے اور اسکی یہ محرومی ہی گناہ اور جرم کے نام سے موسوم ہوتی ہے پس گناہ کا وجود خدا کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ وہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ لہذا اسکی وجہ سے خدا پر حرف گیری کرنا یا خدا کے خلاف استدلال کرنا بالکل غلط اور باطل ہے۔ خدا نے تو انسان کی فطرت میں نیکی کا تخم ودیعت کیا۔ اور پھر اس تخم کی آبپاشی اور پرورش اور ترقی کے لئے اپنے پاس سے ایک شریعت نازل فرمائی۔ اور نشانات اور آیات کے ذریعہ لوگوں کو سمجھایا اور ان پر حجت پوری کی کہ اس شریعت کی پابندی میں ہی انکی نجات اور فلاح ہے۔ باوجود اس کے اگر پھر بھی کوئی شخص خدا کی نازل کردہ شریعت پر عمل پیرا نہ ہو تو یہ اس کا اپنا قصور ہوا نہ کہ خدا کا۔ اور اس کی

محرومی خود اس کے فعل کا نتیجہ ہوئی نہ کہ خدا کے فعل کا۔ گناہ کیا ہے؟ یہی کہ انسان خدا کے حکم کی نافرمانی کرے اور جو طریق اس نے بتایا ہے اس کے خلاف چلے۔ پس گناہ انسان کے فعل کا نتیجہ ہے نہ کہ خدا کا۔ کیا خدا اس وجہ سے ہمیں ہدایت کا رستہ بتانے سے باز رہتا کہ بعض لوگ اس ہدایت کو نہ مانینگے۔ کیا ایک باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے سے صرف اس وجہ سے باز رہ سکتا ہے کہ شاید وہ میری نافرمانی کرکے مجرم بنجاوے۔ یہ نادانی اور جہالت کی باتیں ہیں جس سے ہر عقلمند کو پرہیز لازم ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ دنیا میں جو گناہ اور معاصی اور ایک دوسرے کے خلاف ظلم وستم کے نظارے نظر آتے ہیں یہ لوگوں کے اپنے افعال کا نتیجہ ہیں اور خدا پر اسکی قطعاً کوئی ذمہ واری نہیں اور نہ اسکی وجہ سے کوئی عقلمند خدا کی ہستی کے خلاف استدلال پکڑ سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے تو سراسر رحمت ہی رحمت کا نزول ہوا ہے مگر جو شخص اس رحمت سے فائدہ نہیں اُٹھاتا وہ اپنے فعل کا خود ذمہ وار ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خدا نے شریعت کا قانون ایسا کیوں نہیں بنایا کہ کوئی شخص اسے توڑ ہی نہ سکتا اور سب لوگ اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتے اور اس طرح گناہ کا وجود دنیا میں پیدا ہی نہ ہو سکتا۔ اور سارے لوگ نیک اور پارسا رہتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو انسان کے پیدا کرنے کی غرض ہی باطل چلی جاتی جو یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش اور جدوجہد سے اپنے لئے ہر قسم کے اعلیٰ ترقیات کے دروازے کھولے اور خدا تعالیٰ کے انعام واکرام کا حقدار بنکر اس کا قرب حاصل کرے۔ پس اگر ہر شخص مجبور ہوتا کہ خدا کی نازل کردہ شریعت کے مطابق اپنی زندگی رکھے تو انسان کے لئے یہ سب ترقیات کے دروازے مسدود ہو جاتے۔ اور کوئی شخص انعام واکرام کا حقدار نہ بن سکتا اور یہ سارا سلسلہ جہد وعمل کا بیکار جاتا۔ خوب سوچ لو کہ انعام کا حقدار بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان صاحبِ اختیار ہو۔ یعنی چاہے تو نیکی کے رستے کو اختیار کر لے اور چاہے تو بدی کے رستے کو۔ اور اگر وہ مجبور ہو تو پھر یقیناً نیکی سے محبت کرنے والے۔ اور نیکی سے محبت نہ کرنے والے۔ ٹھیک رستے پر چلنے والے۔ اور ٹھیک رستے پر نہ چلنے والے۔ اپنے نفس پر قابو رکھنے والے۔ اور اپنے نفس پر قابو نہ

رکھنے والے۔ استقلال اور صبر سے کام لینے والے۔ اور استقلال اور صبر سے کام نہ لینے والے۔ محنت کرنے والے۔ اور محنت نہ کرنے والے سب برابر ہو جاتے۔ اور اچھے بُرے میں کوئی امتیاز نہ رہتا۔ اور نیز جو ترقی باہمی مقابلہ اور رشک و مسابقت کے خیال کی وجہ سے اس وقت حاصل ہو رہی ہے وہ سب رُک جاتی۔ اور ترقی کرنے کا کوئی محرک دُنیا میں باقی نہ رہتا۔ اور انسان گویا ایک منجمد صورت اختیار کر لیتا۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک فرشتہ کیطرح ہو جاتا۔ جسکی نیکی در اصل کوئی نیکی کہلانے کی حقدار نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی خلقت سے مجبور ہے کہ ٹھیک رستے پر چلے۔ اور اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ خدا کے منشاء سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو۔ اور اسی لئے عقلمندوں کا قول ہے کہ فرشتہ کی نسبت انسان کا مرتبہ بہت بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنے سوچ بچار اور غور و فکر کے نتیجے میں نیکی اختیار کرتا ہے لیکن فرشتہ اپنی نیکی کی حالت میں بطور ایک قیدی کے محصور ہے اور اس لئے اسکی نیکی در اصل کوئی نیکی نہیں اور اسی لئے قرآن شریف نے بھی انسان کے متعلق فرمایا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی ہم نے انسان کو جملہ مخلوقات میں سے بہترین فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور کوئی دوسری مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ الغرض انسان کا اپنے اعمال میں صاحبِ اختیار ہونا اسکے کمال کی علامت ہے اور گناہ کا وجود اس اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ پس گناہ خدا کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ خدا کی رحمت کے انکار کا ثمرہ ہے۔ لہذا اس کا وجود خدا کی ہستی کے خلاف ہرگز بطور دلیل کے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وھو المراد ÷

چھٹی دلیل اور اس کا ردّ

چھٹی دلیل جو دہریوں کیطرف سے ہستی باری تعالی کے خلاف پیش کی جاتی وہ بھی دلیل پنجم کیطرح قانونِ نیچر کے ایک فرضی اندھیر پر مبنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں بعض ایسی چیزوں کا وجود پایا جاتا ہے کہ جن کا فائدہ کوئی نہیں ہے اور انکی مضرت عیاں ہے مثلاً یہ جو دُنیا میں بیشمار ضرر رساں حیوانات اور زہریلی بیل بوٹیاں اور مہلک معاون

پائے جاتے ہیں جن کا صرف نقصان ہی نقصان ہے اور فایٔدہ کچھ بھی نہیں ان کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ اس کائنات کے اوپر کوئی خدا نہیں ہے ورنہ یہ چیزیں دُنیا میں نہ پائی جاتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض معترضین کی جہالت کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو اسبات میں ذرہ بھر شک نہیں رہتا کہ دُنیا کی کوئی چیز بھی در حقیقت بغیر کسی فایٔدہ اور غرض وغایت کے نہیں ہے اور یہ صرف انسان کے اپنے علم کی کمی ہے کہ وہ بعض چیزوں کی غرض وغایت کو نہیں سمجھتا۔ اور انکے فایٔدہ سے جاہل رہتا ہے اور صرف ظاہری طور پر ان کے بعض ضرر رسان اثرات کو دیکھ کر یہ خیال کر لیتا ہے کہ ان چیزوں میں کوئی فایٔدہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حقایٔق الاشیاء کی تحقیق میں بڑھے ہوئے ہیں ان کیطرف سے ایسا اعتراض بہت کم ہوتا ہے اور صرف عامۃ الناس اس قسم کے شبہات کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ بوجہ اپنی جہالت کے حقایٔق الاشیاء سے بہت ہی کم آگاہ ہوتے ہیں اور ان کی نظر اشیا کی ظاہری شکل و صورت اور ظاہری افعال واثرات سے آگے نہیں جاتی۔ اور زیادہ باریک اور گہرا مطالعہ انہیں میسر نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ زیادہ وسیع مطالعہ رکھتے ہیں اور انکی نظر ظاہر سے گذر کر حقایٔق کی گہرائیوں تک پہنچنے کی عادی ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ہر چیز اپنے اندر کوئی نہ کوئی فایٔدہ رکھتی ہے اور یہ کہ جتنا کسی چیز کا زیادہ مطالعہ کیا جاوے اتنا ہی اسکے فوایٔد اور اسکی ہستی کی غرض وغایت زیادہ نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں اور اسی لئے اگر ایسے لوگوں کو کسی چیز میں ایک وقت کوئی فایٔدہ نظر نہیں بھی آتا تو وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ اس کا وجود محض فضول اور باطل ہے بلکہ وہ اس یقین پر قایٔم رہتے ہیں کہ زیادہ گہرے مطالعہ سے آیٔندہ کسی وقت اس کے اندر بھی کوئی حکمت اور کوئی فایٔدہ معلوم ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ بار بار کے تجربات سے یہ یقینی علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں کہ جو چیزیں ظاہری اور سرسری نظر میں بے فایٔدہ بلکہ ضرر رسان نظر آتی ہیں ان کے اندر بھی گہرے مطالعہ اور تحقیق سے بہت سے فوایٔد دریافت ہو جاتے ہیں پس یہ اعتراض محض جہالت کا اعتراض ہے اور حق یہی ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنے اندر کوئی نہ کوئی حکمت اور کوئی نہ کوئی فایٔدہ رکھتی ہے

اور حقایق الاشیاء کے مطالعہ میں انسان جتنا بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔ اتنا ہی اس کے اندر یہ یقین زیادہ راسخ اور زیادہ بصیرت کے ساتھ قایم ہوتا جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی باطل نہیں افسوس معترضین اسبات کو بھی نہیں سوچتے کہ گذشتہ زمانوں میں جبکہ حقائق الاشیاء کا علم بہت محدود تھا اور سائنس کے علوم کیطرف لوگوں کی توجہ بہت کم تھی۔ اس وقت موجودہ زمانہ کی نسبت بہت زیادہ چیزیں ایسی تھیں جو بالکل بے فایدہ بلکہ ضرررسان نظر آتی تھیں لیکن حقائق الاشیاء کے علم اور سائنس کی تحقیقاتوں کی ترقی کی وجہ سے آج ان میں سے بہت سی چیزوں کے اندر خاص فوائد نظر آرہے ہیں اور انکے نقصانات کی بھی جدید علوم کی روشنی میں معقول تشریح کیجاسکتی ہے بلکہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انکی بھی ضرررسانی بالواسطہ طور پر نسل انسانی کے لئے مفید ہے۔ کیا یہ نظارہ ایک عقلمند انسان کے خیال کو اس طرف مائل کرنیکے لئے کافی نہیں ہے کہ جو چیزیں دنیا میں آج بے فایدہ اور محض ضرررسان نظر آرہی ہیں ان میں سے بہت سی کل کو مخفی فوائد سے معمور نظر آئینگی۔ اور پرسوں ان چیزوں کے متعلق علم و معرفت کا دائرہ اور بھی وسیع ہوجائے گا اور اسی طرح ہر روز نئے علوم اور نئی تحقیقاتوں کے ذریعہ سے علم بڑھتا جائے گا اور جہالت کم ہوتی جائیگی۔ جیساکہ قرآن شریف اور حدیث میں بھی بیان ہوا ہے کہ آخری زمانہ میں زمین و آسمان کے مخفی خزانے باہر نکل آئینگے اور نئے نئے علوم کی اشاعت ہوگی۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہوگی۔ کہ کوئی شخص صرف اپنے موجودہ علم کی بنا پر دنیا کی لاتعداد چیزوں کے حقایق اور ان کی سودمندی کا انکار کردے اور انکی بعض ضرررسان تاثیرات کی وجہ سے جو وہ بھی قدرت کی باریک در باریک حکمتوں پر مبنی ہیں اور ان سے بالواسطہ طور پر بنی نوع انسان اور دیگر مخلوقات کو طرح طرح کے منافع پہنچتے رہتے ہیں یہ خیال کرنے لگجاوے کہ ان چیزوں میں سوائے ضرررسانی کے اور کچھ نہیں۔ میں مثالیں دیکر اس مضمون کو طول نہیں دینا چاہتا ورنہ میں بتاتا کہ کس طرح حیوانات میں بھی اور نباتات میں بھی اور جمادات میں بھی ایسی چیزیں موجود ہیں جو آج سے پہلے محض بے فایدہ نظر آتی تھیں اور سوائے ضرررسانی کے ان کا اور کوئی کام نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن آج وہی چیزیں طرح طرح سے انسان کی خدمت میں لگی ہوئی

ہیں۔ حتیٰ کہ سانپ اور بچھو اور مہلک بیماریوں کے جراثیم اور مختلف اقسام کے خطرناک زہر وغیرہ بھی اس خدمت انسانی سے باہر نہیں اور کوئی دن ایسا نہیں چڑھتا جس میں قرآن شریف کے اس قول کی صداقت کہ خدا نے زمین و آسمان کی کسی چیز کو باطل نہیں پیدا کیا بیش از پیش وضاحت کے ساتھ ثابت نہ ہوتی جاتی ہو÷

باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر یہ درست ہے کہ خدا نے کسی چیز کو باطل نہیں پیدا کیا اور ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے تو ان چیزوں کے ضرر رسان پہلو کیوں رکھے گئے ہیں اور ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ تمام چیزیں ضرر رسان ہونے کے بغیر فائدہ بخش ہوتیں۔ یعنی مثلاً سانپ سے جو فائدہ انسان کو یا دوسری مخلوق کو پہنچ سکتا تھا وہ کسی ایسے رنگ میں پہنچایا جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی ضرر رسان پہلو نہ ہوتا۔ سو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خالق فطرت نے جس طرح مناسب سمجھا اس طرح کیا۔ اور ہمارا یہ کام نہیں کہ نیچر کے افعال کی تفاصیل کو زیر تنقید لائیں اور نہ ہم اس کے اہل ہیں بلکہ ہمارا کام صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ اصولی طور پر حق و انصاف اور رحم و عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ لہذا جب یہ ثابت ہے کہ دنیا کی کوئی چیز محض ضرر رسان نہیں ہے بلکہ اس کے اندر یقینی فوائد مخفی ہیں اور جو چیزیں بے فائدہ اور محض ضرر رسان نظر آتی ہیں وہ بھی درحقیقت ایسی نہیں بلکہ صرف ہمارے علم کی کمی کی وجہ سے وہ ہمیں ایسی نظر آتی ہیں تو نیچر کی تفصیلات میں جاکر یہ سوالات اٹھانا کہ فلاں چیز کو اس اس طرح کیوں بنایا گیا ہے اور اس اس طرح کیوں نہیں بنایا گیا۔ ہرگز سلامت روی کا طریق نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور نہ کوئی عقلمند یہ خیال کر سکتا ہے کہ جو شخص دوسری مخلوقات کی طرح اپنے آپ کو بھی محض مخلوق خیال کرتا ہے وہ اصولِ خلق و تکوین میں اس قدر تفصیلی نظر رکھ سکتا ہے کہ ہر چیز کے متعلق وہ یقینی طور پر یہ بتا سکے کہ وہ اس اس اصول کے ماتحت اس اس شکل و صورت میں بنائی گئی ہے پس پہلا جواب تو میرا یہی ہے کہ جب اصولی طور پر ایک بات ثابت ہو جاوے تو خواہ نخواہ ایک سوال کے اوپر دوسرا سوال جماتے چلے جانا کہ یہ اس طرح کیوں ہے اور وہ اس طرح کیوں نہیں ہے

ہرگز سلامت روی کی راہ نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر اس قسم کے تمام جزئی اور تفصیلی اعتراضات کے حل ہو جانے پر ہی کوئی چیز قبول کی جانی چاہیئے تو پھر کبھی بھی کسی بحث کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس قسم کے سوالات کا سلسلہ غیر متناہی طور پر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ پس عقلمندی کی راہ یہی ہے کہ جب اصولی طور پر ایک بات سمجھ آجاوے تو خواہ اسکی بعض جزئی تفصیلات حل نہ بھی ہوں اسے قبول کر لیا جاوے اور باقی کو حوالہ بخدا کیا جاوے۔ اس کے بعد میں اصل جواب عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ علاوہ اس کے کہ بعض اشیاء کی ضرر رسانی اس رنگ میں فائدہ بخش ہے کہ وہ بعض مفید نتائج کے پیدا کرنے میں ممد ہوتی ہے۔ جیسا کہ مثلاً سانپ کا زہر بعض خطرناک بیماریوں کے علاج میں کام آتا ہے۔ اور قانونِ نیچر کے ماتحت اس کا یہ فائدہ اس کے زہر ہونے کی خاصیت کے ساتھ بطور لازم ملزوم کے ہے۔ یہ ضرر رسانی اس رنگ میں بھی مفید اور نفع مند ہے کہ اس سے بنی نوع انسان کی اخلاقی اصلاح اور مادی ترقی میں بالواسطہ طور پر بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ ہر عقلمند میرے ساتھ اس بات میں اتفاق کرے گا کہ کبھی کبھی تکالیف اور دُکھوں کا پیش آنا انسان کے اخلاقِ حسنہ کی عمارت کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری ہے اور کوئی شخص جسے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی تکلیف اور دُکھ اور مصیبت کا سامنا نہ ہوا ہو۔ اپنے اخلاق میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح انسان کی مادی ترقی کے بھی بہت سے پہلو تکالیف اور مصائب کے پیش آنے کے بغیر پوری طرح نشوونما نہیں پا سکتے۔ لہذا دُنیا میں بعض چیزوں کا اپنے اندر ضرر رسان پہلو رکھنا بالواسطہ طور پر انسان ہی کے فائدہ اور ترقی کے لئے ہے اور کوئی عقلمند اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اور یقیناً اس میں اور بھی بہت سے فوائد مخفی ہونگے۔ جن کو ابھی تک ہم معلوم نہیں کر سکے۔ اور اگر کسی کو یہ شُبہ گذرے کہ اگر یہ ضرر رسان جانور وغیرہ واقعی مفید ہیں تو ان کو تباہ و برباد کیوں کیا جاتا ہے اور کیوں بعض صورتوں میں خود مذہب انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ فلاں فلاں چیز کو ہلاک کرتے رہنا چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قانونِ نیچر کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ وہ دنیا میں ہر چیز کے متعلق ایک توازن قائم رکھنا چاہتی ہے اور افراط و تفریط کا طریق اس کے مسلک

کے خلاف ہے۔ پس چونکہ جو چیزیں اپنے اندر نمایاں طور پر ضرر رسان پہلو بھی رکھتی ہیں ان کا دُنیا میں حد اعتدال سے بڑھ جانا بمقابلہ ان کے فائدہ کے نقصان کا زیادہ موجب ہو سکتا ہے اور ان کے فائدہ کا پہلو اسی صورت میں غالب رہ سکتا ہے کہ انکی تعداد دنیا میں زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے کمال حکمت سے ایک طرف تو ان چیزوں کو دُنیا میں پیدا کر دیا۔ اور دوسری طرف انسان کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی اور بعض صورتوں میں صراحتہً حکم بھی دے دیا کہ ان چیزوں کو دنیا میں زیادہ نہ پھیلنے دو۔ اور اس طرح نیچر کا فطری توازن قائم کر لیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ دُنیا کی بعض چیزوں کا اپنے اندر ضرر رسان پہلو رکھنا ہرگز موجب اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور حق یہی ہے کہ دُنیا کی ہر چیز ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کی گئی ہے اور بعض اشیاء کی ضرر رسانی بھی بالواسطہ طور پر انسان ہی کے فائدہ کے لئے ہے پس دہریوں کا یہ اعتراض بالکل فضول اور لغو ہے جس سے معترضین کی جہالت کے سوا اور کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی

یہ چھ اصولی دلیلیں ہیں جو دہریوں کی طرف سے عام طور پر اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں مگر یہ سب دلیلیں ایک خیال کے لوگوں کی نہیں ہیں بلکہ مختلف خیال کے لوگوں کی پیش کردہ ہیں اور اسی لئے ان میں سے بعض ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ یعنی ایک کے قبول کرنے سے دوسری کو رد کرنا پڑتا ہے لیکن چونکہ مجھے ہر خیال کے دہریوں کی تردید مقصود تھی۔ اس لئے میں نے سب قسم کے دلائل کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ ان چھ اصولی دلائل کا جواب سمجھنے کے بعد ہر فہمیدہ شخص دہریوں کے عام اعتراضات کا جواب دے سکنے کے قابل ہو سکے گا۔ در اصل حق یہی ہے کہ دہریوں کے ہاتھ میں کوئی دلیل نہیں ہے اور ان کے انکار کی اصل بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ انکے خیال میں ابھی تک ان کے سامنے ہستی باری تعالیٰ کی کوئی ایسی دلیل نہیں آئی جو ان کے دل میں یقین اور اطمینان پیدا کر سکے اور اسی لئے ان میں سے جو لوگ نسبتاً فہمیدہ ہیں وہ کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ کوئی خدا نہیں ہے کیونکہ اس دعویٰ سے ان کے اوپر ایک ایسی ذمہ واری عائد ہو جاتی ہے جسے وہ ہرگز نبھا نہیں سکتے بلکہ وہ صرف یہ کہنے

ہیں کہ ہمارے پاس خدا کے موجود ہونیکا کوئی ثبوت نہیں لیکن جن لوگوں نے میرے اس مضمون کو نیک نیتی اور غور کے ساتھ پڑھا ہے وہ اس بات کو ضرور سمجھ گئے ہونگے کہ عقلی دلائل کے دائرہ میں بھی خدا کی ہستی کی تائید والے دلائل کا پہلو اس قدر غالب ضرور ہے کہ انہیں سمجھ لینے کے بعد کوئی عقلمند انسان کم از کم خدا کا منکر نہیں رہ سکتا۔ اور درحقیقت جیسا کہ مَیں نے شروع مضمون میں تصریح کے ساتھ بیان کیا تھا عقلی دلائل کی پہنچ بھی صرف اسی حد تک ہے کہ وہ خدا کے موجود ہونے کے متعلق ایک ابتدائی مرتبہ یقین کا پیدا کردیں اور کامل اور قطعی یقین ان دلائل سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے دوسری قسم کے دلائل کی ضرورت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا بیان انشاء اللہ آگے چل کر اپنے وقت پر آئے گا ÷

اب میں اس حصہ مضمون کو ختم کرتا ہوں جو ہستی باری تعالیٰ کے عقلی دلائل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جیسا کہ مَیں نے شروع مضمون میں بیان کیا تھا۔ آخر میں پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مَیں نے اس مضمون میں باریک علمی بحثوں سے احتراز کیا ہے اور صرف موٹی موٹی باتوں کو کسی قدر تصریح کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور دراصل میرے مخاطب بھی زیادہ تر نوجوان طبقہ کے لوگ ہیں جو بوجہ اپنی طبیعت کی خامی کے بعض اوقات جدید تعلیم سے غلط طور پر متاثر ہو کر ملحدانہ خیالات قائم کر لیتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ مَیں نے لکھا ہے وہ ایک صاف دل انسان کے لئے کافی ہے اور اگر کسی شخص کے دل میں اس مضمون کے پڑھنے کے بعد بھی کوئی شبہ رہے تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ ان اصولی باتوں کی روشنی میں حل کیا جا سکے گا جو مَیں نے اس جگہ بیان کی ہیں۔ باقی ایسے شخص کا علاج میرے پاس کوئی نہیں ہے اور نہ کسی اور شخص کے پاس ہے جو خواہ مخواہ کجروی کا طریق اختیار کر کے اپنے آپ کو شبہات کے بھنور سے نکالنا نہیں چاہتا یا جو اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھے رکھ کر حق و صداقت کو دیکھنے اور شناخت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج صرف خدا کے پاس ہے اور میں دُعا کرتا ہوں کہ وہ ان کے دل کی کجی کو دُور کرے۔ اور انکی آنکھوں کی پٹی کو اُتارے اور اپنے فضل خاص سے ایسا انتظام

فرماوے کہ اس کا کوئی بندہ بھی ایسی حالت میں دنیا سے رخصت نہ ہو کہ وہ اپنے خالق و آقا کو نہ پہچانتا ہو۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی بدقسمتی اور محرومی نہیں۔ و

اٰخرِ دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین ؂

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بانئے سلسلہ عالیہ احمدیہ کی ایک تحریر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں :-

"کیا بدبخت وہ انسان ہے جسکو اب تک یہ پتہ نہیں کہ اس کا ایک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ ہمارا بہشت ہمارا خدا ہے۔ ہماری اعلیٰ لذات ہمارے خدا میں ہیں کیونکہ ہم نے اس کو دیکھا اور ہر ایک خوبصورتی اس میں پائی۔ یہ دولت لینے کے لائق ہے اگرچہ جان دینے سے ملے۔ اور یہ لعل خریدنے کے لائق ہے اگرچہ تمام وجود کھونے سے حاصل ہو۔ اے محرومو! اس چشمہ کیطرف دوڑو کہ وہ تمہیں سیراب کریگا یہ زندگی کا چشمہ ہے جو تمہیں بچائے گا۔ میں کیا کروں اور کس طرح یہ خوشخبری دلوں میں بٹھا دوں۔ کس دف سے میں بازاروں میں منادی کروں کہ تمہارا یہ خدا ہے تا لوگ سُن لیں۔ اور کس دوا سے علاج کروں تا سُننے کے لئے لوگوں کے کان کھلیں" ؂

(کشتی نوح)

سلسلہ عالیہ احمدیہ کا ایک ادنیٰ خادم

خاکسار

مرزا بشیر احمد

قادیان ۱۱؍ نومبر ۱۹۲۷ء

تصانیف حضرت مسیح موعود علیہ السلام

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	براہین احمدیہ چار حصے	ع ۸/	۲۰	نور القرآن حصہ اوّل	۲/
۲	سرمہ چشم آریہ	عہ ۱۲/	۲۱	ست بچن	۱۲/
۳	فتح اسلام	۲/	۲۲	آریہ دھرم	۵/
۴	توضیح مرام	۳/	۲۳	اسلامی اصول کی فلاسفی	۵/
۵	آسمانی فیصلہ	۳/	۲۴	انجام آتھم	ع/
۶	نشان آسمانی	۴/	۲۵	ضمیمہ انجام آتھم	
۷	برکات الدعاء	۳/	۲۶	استفتاء	۱۰/
۸	حجۃ الاسلام	۲/	۲۷	سراج منیر	۶/
۹	سچائی کا اظہار	ع ۶/	۲۸	تحفہ قیصریہ	۴/
۱۰	تحفہ بغداد		۲۹	حجۃ اللہ	
۱۱	کرامات الصادقین		۳۰	سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب	۳/
۱۲	شہادت القرآن	۱۰/	۳۱	فریاد درد البلاغ	۸/
۱۳	نور الحق حصہ اول	۸/	۳۲	نجم الہدیٰ	۱/
۱۴	" " حصہ دوم	۶/	۳۳	ضرورت الامام	۰۴/
۱۵	اتمام الحجۃ		۳۴	راز حقیقت	۰۲/
۱۶	سر الخلافہ		۳۵	ایام الصلح فارسی	۸/
۱۷	انوار الاسلام	۴/	۳۶	حقیقت المہدی	۰۱/
۱۸	منن الرحمان	۱۲/	۳۷	مسیح ہندوستان میں	۵/
۱۹	ضیاء الحق	۲/	۳۸	تریاق القلوب	ع ۴/

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۳۹	تحفہ غزنویہ	۲ر	۶۰	الوصیت	۲ر
۴۰	لجۃ النور	۳ر	۶۱	چشمہ مسیحی	۳ر
۴۱	اربعین کامل	۱۲ر	۶۲	قادیان کے آریہ اور ہم	۳ر
۴۲	تحفہ گولڑویہ	عہ	۶۳	حقیقۃ الوحی	صر
۴۳	خطبہ الہامیہ	عہ	۶۴	چشمہ معرفت	۸ر ع
۴۴	اعجاز المسیح		۶۵	پیغام صلح	۲ر
۴۵	دافع البلاء	۳ر	۶۶	جنگ مقدس	۱۲ر
۴۶	الہدیٰ		۶۷	تصدیق النبی	۵ر
۴۷	نزول المسیح	۱۲ر	۶۸	دُرِّ مکنون فارسی	عہ
۴۸	کشتی نوح	۶ر	۶۹	آمین حضرت فضل عمر	ـر
۴۹	تحفۃ الندوہ	۰ر	۷۰	آمین حضرت صاحبزادگان	ـر
۵۰	اعجاز احمدی	۶ر	۷۱	رپورٹ ۱۸۹۷ء	۸ر
۵۱	ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی	۰ر	۷۲	تقریر جلسہ دُعا	۱ر
۵۲	مواہب الرحمٰن	۶ر	۷۳	تقریریں	۳ر
۵۳	نسیم دعوت	۴ر	۷۴	بحر العرفان	۶ر
۵۴	سناتن دھرم	۱ر	۷۵	رہنمائے خاتون	۲ر
۵۵	تذکرۃ الشہادتین	۱۲ر	۷۶	مکتوبات احمدیہ جلد ۱ تا ۵ فی	۸ر
۵۶	سیرۃ الابدال		۷۷	تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات)	
۵۷	لیکچر لاہور	۲ر		حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام	
۵۸	لیکچر سیالکوٹ	۴ر		جلد اوّل عمر - دوم عہ - سوم	۶ر
۵۹	براہین احمدیہ حصہ پنجم مع ضمیمہ	۸ر ع		چہارم عمر - پنجم ۸ر - ششم	۸ر عہ

ملنے کا پتہ :- مینجر بک ڈپو تالیف واشاعت قادیان دار الامان پنجاب